(ایک رومانی ناول)

مصنفہ

بی۔ ایچ۔ سرشار

پبلشر:-

مصنف۔ پتہ۔ ۶۶ ایلیٹ روڈ کلکتہ ۱۶

تاج پریس کلکتہ

طبع اوّل ایک ہزار

قیمت فی جلد چار روپے

نقد و نظر

"ناول نگاری اور یوں تو بہت آسان چیز ہے اگر
وہ محض کہانی کی حیثیت رکھتی ہے لیکن اگر
اس میں نفسیاتی حقائق زندگی کو بھی
شامل کر لیا جائے تو پھر وہ ایک نوع
کا فلسفہ بن جاتی ہے اور فلسفے کا لکھنا
آسان نہیں۔

اس ناول میں

فاضل مصنف نے منفرد صناعت فن کے
ساتھ ساتھ حقائق زندگی کو جس خوبی کے
ساتھ پیش کیا ہے وہ یقیناً قابل داد ہے اور
اس لحاظ سے میں سمجھتا ہوں کہ عہد حاضر کے ناولوں
میں یہ ناول قدر اول کی حیثیت رکھتا ہے"

علامہ نیاز فتحپوری
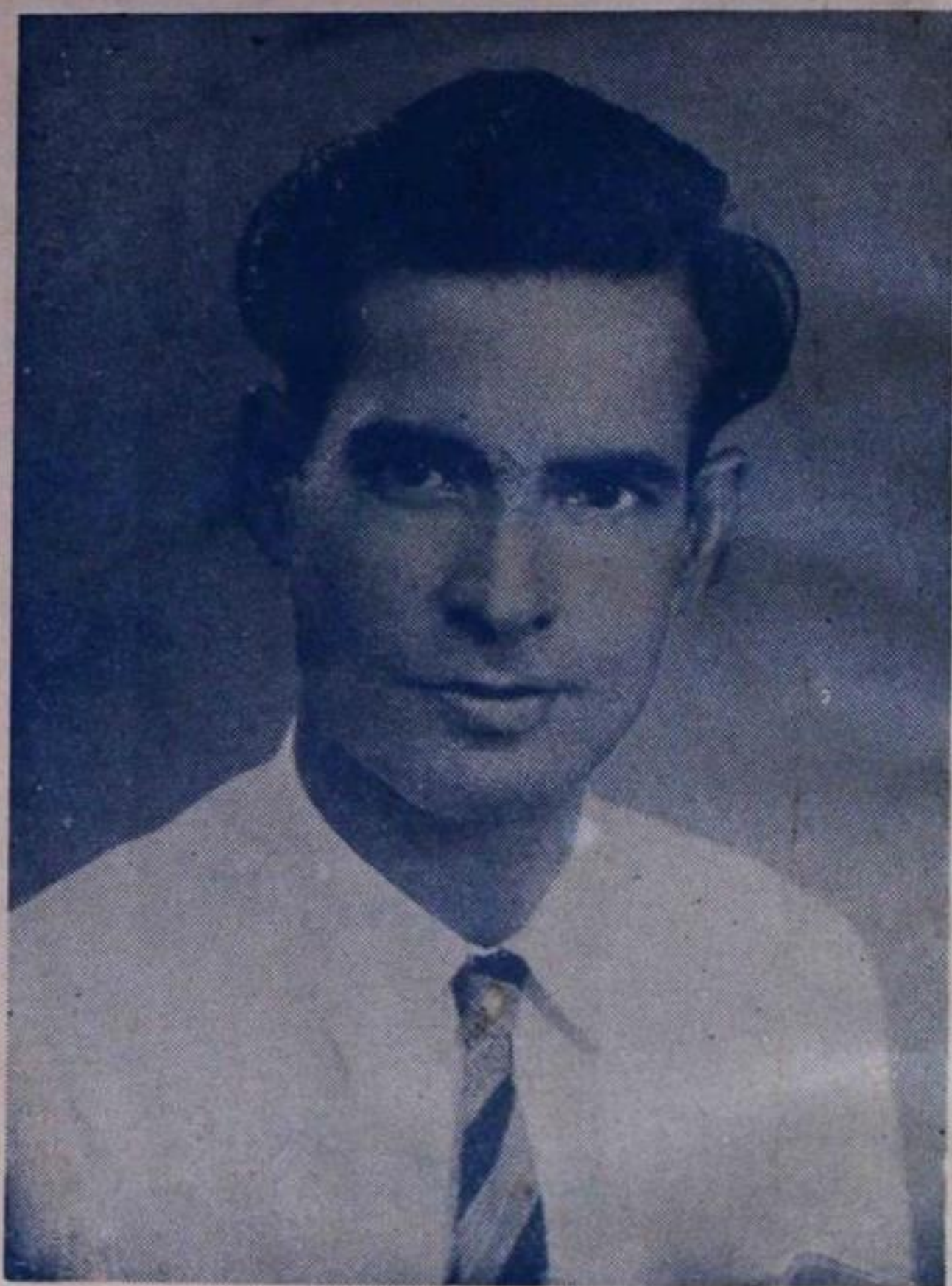
(پیام مجوشی)

«شور لیست نوا ریزی تارِ نغمہ را
پیدا نہ است جنبشِ مضراب کجا بی»

"میں ایک کلمہ ہوں - میرا نام کلام ہے اور میں میں ہی ہوں اور لفضلہ میں
اس کہانی کا ہیرو بھی ہوں - میرا تعارف یہ ہے کہ میں انسان کا انا ہوں
اور میں [illegible] بھی ہوں اسلئے کہ انا ہر شے میں ہے اور [illegible] بھی ہے۔"

انتساب

تصنیف بیگم حسن سرشار کے نام معنون ہے اس لئے کہ آپ [illegible]
اردو زبان سے دلچسپی نہیں [illegible] منسوب ہے اردو ادب
کے ان شائقین کی طرف جو ادب کو موضوعِ تفریح کے علاوہ ادبی
سائنس بھی سمجھتے ہیں۔

(اس ناول میں نام اور مقامات سب فرضی ہیں)

تعارف

از جناب عبد الرؤف صاحب، لکچرار شعبہ اردو کلکتہ یونیورسٹی

زیرِ نظر تصنیف ایک مرقعہ ہے جس میں مصنف نے اپنے تجربات و مشاہدات کے نقوش پیش کئے ہیں۔ جن میں تازگی بھی ہے اور رعنائی بھی، سنجیدگی بھی اور خونِ جگر کی آمیزش بھی۔

ع "معجزہ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود"

"ان نقوش کی تخلیق میں مصنف نے فلسفہ سیاست، معاشیات اور ادب کا سہارا لیا ہے جنکی بنیاد محض مفروضات پر نہیں بلکہ حقائق زندگی پر ہے اور جن میں صرف تلخی نہیں بلکہ مستی بھی ہے۔ کہانی رومانی ہے لیکن مصنف نے رومان کو جس انداز سے پیش کیا ہے اسکا مقصد زندگی سے فرار نہیں بلکہ ہمیں وہ بتانا چاہتا ہے کہ زندگی کو کسطرح فرسودگی اور روایات کی بندھنوں سے آزاد کیا جائے اور کسطرح اسکے معیار کو بلند کیا جائے۔ انداز بیاں نہایت سنجیدہ اور ساتھ ہی ساتھ دلکش بھی ہے سنجیدگی اور شگفتگی دونوں کا یکجا ہونا مشکل ہے اس باب میں مصنف کی ذہانت اور عرق ریزی قابل داد ہے۔"

از جناب نیاز احمد خاں صاحب لکچرار مولانا آزاد کالج کلکتہ

"خواب پریشاں اپنی نوعیت کی ایک منفرد تصنیف ہے جسمیں کوائف زندگی پر تحقیقی نظر ڈالی گئی ہے۔ اس میں جہاں فلسفہ زندگی سے متعلق وقیع خیالات ہیں وہاں تاریخ تمدن کے ضمن میں بڑی مفید اور دلچسپ باتیں ہیں۔ بہت سے الجھے ہوئے مسائل کو جدید نفسیات کی روشنی میں حل کرنے کی سعی ہے اور لطف یہ ہے کہ ثقیل سے ثقیل فلسفیانہ اور نفسیاتی نکات کو عبارت کی شگفتگی نے اور مصنف کے مخصوص انداز بیاں نے بے حد دلچسپ اور مرغوب خاطر بنا دیا ہے۔ فنی نکتہ نظر سے بھی مصنف کا آرٹ ہے۔

مجھے یقین ہے کہ پڑھنے والوں کے شستہ طبقہ میں یہ کتاب بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھی جائے گی۔"

ازجناب شاہ مقبول احمد صاحب لکچرار مولانا آزاد کالج کلکتہ

"خواب پریشاں کے" مطالعہ سے یہ امر پایہ ثبوت کو پہونچتا ہے کہ مصنف اپنے خیالات اور معتقدات میں بڑا خلوص اور انہماک رکھتے ہیں۔ مصنف کمال ہوشیاری اور چابکدستی سے تصویر کے خدوخال میں اسطرح رنگ وروغن دیتے ہیں کہ کہیں بے کیفی نہیں معلوم ہوتی اور تاثیر بیک وقت مصنف کے خلوص اور قاری کی اثر پذیری پر مہر تصدیق ثبت کردیتی ہے سماجی، معاشی اور سیاسی افکار ومسائل پر مصنف کی حقیقت پسندانہ مختصر آراان کے ذہن وشعور کی پختگی اور بلوغیت کی بین اور واضح مثالیں ہیں۔ اور شاید ایسی معیاری اور سلجھی ہوئی بحثیں فی زمانہ کسی کتاب میں مشکل سے ایک جگہ ملتی ہیں۔

میں سمجھتا ہوں یہ کتاب اردو ادب میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کی مستحق ہے کہ شائقین اس کو ہاتھوں ہاتھ لیں۔"

رُخِ اوّل

۱۔

خوابِ پریشاں۔

جذبات کی دنیا میں "ضد" اور "محبت" ایک ہی قبیل کی کیفیتیں ہیں۔ بظاہر ان دونوں کوائف میں کسی قدر اختلاف نظر آتا ہے لیکن باطن میں وہ ایک ہیں ۔ یہ انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ آپ اسے جس فعل سے روکئے وہ عام طور سے اسی فعل کا مرتکب ہوتا ہے ۔ اور اس ارتکاب کے لئے وہ فطرتاً مجبور ہے۔ درحقیقت ممانعت اس کی ذات پر دباؤ کا کام کرتی ہے اور اس کی حریفانہ ذہنیت کسی دباؤ کی روادار نہیں۔ اور یہ تو اس کا ایک عظیم ورثۂ حیوانی ہے جو درحقیقت اسکے جملہ کمالاتِ انسانی کا سنگ بنیاد ہے، چنانچہ اس کی ذات کا خاصّہ ہے کہ آپ اسے جس قدر دبانے کی کوشش کریں گے وہ اتنا ہی ابھرنا چاہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ممنوع شے اسے محبوبِ نظر ہے۔ اور ہر مذموم حرکت اسے پیاری ہے ۔ اور بحیثیت ایک حیوان کے یہ اس کی فطرت کا ایسا ہمہ گیر خاصّہ ہے کہ اس سے ایک جاہلِ مطلق سے لے کر ایک فاضلِ اجل تک دستبردار نہیں۔ کسی حکیمِ نفسیات کا قول ہے "علم تجربات کا تجزیہ ہے لہٰذا معارف کے میدان میں ایک تائب فاسق وفاجر کا پایہ ایک خاندانی صوفی سے بدرجہا بلند ہے اس لئے کہ اسے "تصویر کے دونوں رُخ یاد ہیں"

—— کہتے ہیں حضرتِ آدم کو خدا نے گندم کھانے کی ممانعت کی تھی۔ لیکن وہ خدا کی بات بھی نہیں مانتے تھے اور انہوں نے گندم کھا لیا تھا۔ پھر تو وہ اس علت میں جنت سے نکال دیئے گئے تھے۔ اس پر بھی وہ کہاں ماننے تھے۔ اور آج بھی آپ اس آدم کی اولاد حضرتِ انسان کو دیکھ لیجئے اسے ہر ممنوع اور ہر مذموم شے سے کسقدر محبت اور کتنا پیار ہے۔ اور پھر فطرت کی راہیں بھی عجیب ہیں۔ آپ محبت ہی کو لیجئے۔ محبت محض ایک نگاہِ غلط انداز کا ایک فعل ہے۔ ایک اچٹتی سی نظر میں اور آنکھ کے جھپکنے تک میں یہ معاملہ طے پا جاتا ہے پھر ذہنی اور ارادی قوتیں کچھ ایسا شدید فیصلہ کر ڈالتی ہیں کہ اس کی تلافی اور تردید ناممکن ہے۔ پھر تو آپ کسی کو محبت کرنے سے لاکھ منع کیجئے لاکھ روکئے۔ آپ اس کی راہ میں لاکھ دیوار چین کھڑی کیجئے لاکھ سدِّ سکندری حائل کیجئے اور لاکھ آہنی پردے کھینچئے آپ جو کچھ بھی کر لیجئے کر لیجئے لیکن آپ اسے محبت سے باز نہیں رکھ سکتے۔ بلکہ الٹے آپ کے تمام تر احتیاط اور سارے دفاعی انتظامات اس کی محبت کے لئے ایک اور تازیانہ بن جاتے ہیں۔ محبت کی دنیا میں کوئی سارٹیفیکٹ نہیں اور کوئی ڈپلوما نہیں جو بہ حسبِ قابلیت اور بقدرِ صلاحیت عطا کئے جا سکتے ہوں۔ اور کچھ قانون بھی نہیں جو زبردستی نافذ کئے جا سکتے ہوں۔ لہٰذا اس امتناع میں کوئی منطق نہیں اور کوئی دلیل نہیں۔ اور ظاہر ہے آپ قدرتی طور پر روک لگانے والے فطرت کے کوئی ایجنٹ ما نہیں لہٰذا آپ کی ساری مساعی فضول ہے۔ آپ فطرت کے منہ نہیں آسکتے اور اس کی گردش نہیں بدل سکتے چنانچہ فطرت کی نگاہ میں ایک نگاہِ غلط انداز کا انتخاب ہی صحیح ہے اور باقی سب غلط —— کہتے ہیں عورت اسی وقت غلطی کرتی ہے جب وہ اپنے لئے عاشق تلاش

کرتی ہے۔ کیونکہ ایسا کرنا انکی فطرتِ نسوانی سے بعید ہے۔ چنانچہ وہ فطرتاً ایک
ایسے شخص کی تلاش میں ہوتی ہے جس سے وہ خود محبت کر سکے۔ یہ جستجو اس کی جبلت
میں ڈالی گئی ہے اور اس کا فقدان یا تو اس کے عورت نہ ہونے کی شہادت ہے یا پھر
اس کی نسوانیت کے معطل ہو جانے کی دلیل ہے۔

یہاں اپنے اور یاسمین کے درمیان اسی قبیل کی بات پیش آگئی تھی۔
خاکسار کی پوزیشن ظاہر تھی کہ کیا بزرگِ محترم، کیا میڈم اور کیا ان کے دیگر متعلقین
ہر کس اور ہر فرد مخلص ارادت کیش اور نیاز مند نظر آتا تھا۔ ان کی محبت، شفقت،
الفت اور شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ اگر خاکسار کے پھانس لگی تھی تو درد ان کے دل میں ہوتا
تھا۔ اور ادھر جو کہیں دل میں درد ہوتا تھا تو اس کی ٹیس ان کے جگر سے اٹھتی تھی۔
حالانکہ اپنی ذات میں کوئی سرخاب کا پر نہیں تھا۔ اور ویسے کوئی کرشمہ نہیں تھا کوئی
سحر کا عمل نہیں تھا اور کوئی معجزہ نہیں تھا جو ان کی تسخیر کا سبب ہو۔ البتہ ایک بات ظاہر
تھی کہ وہ نیازمند اور ارادت کیش خود اپنی ذات میں بڑے عالی صفت اعلیٰ گہر، عالی
ظرف اور حد درجہ کے انسان نواز انسان واقع ہوئے تھے۔ اور ان ساری باتوں
میں ان کی معاشرت ہی کو دخل تھا۔ پھر اس سعادت مندی سے ان کی محبت شیفتگی
اور وارفتگی خالص قدرت کا ایک عطیہ تھی۔ اور وہ قدرت ہی کا ایک فعل نظر آتی
تھی۔ اور پھر وہ اس حد کو چھو رہی تھی کہ اب خطرہ لاحق ہونے لگا تھا۔ اور جان و
دل کی خیر نہیں نظر آرہی تھی۔ کہ یاسمین اب وہ یاسمین نہیں رہی تھی بلکہ وہ ایک
رہزنِ ایمان اور دشمنِ جان بنکر میدان میں مسلح اتر چکی تھی۔ حالانکہ حضرت اور حضرت
کے اہلِ بیت آنکھ بند کئے ہوئے نہیں تھے۔ وہ سب کچھ دیکھتے تھے اور سب کچھ سمجھتے

تھے کہ لڑکی ان کے روبرو اور عین ان کے منہ کے آگے بلکہ عین ان کی آنکھوں میں انگلی ڈالکر کھلے بندوں شمشیر آزمائی کر رہی تھی اور اپنا دامن اور آستین کسی بے گناہ کے خون سے تر کر رہی تھی۔ لیکن اہلِ بیت خاموش تھے، اور ان کی خاموشی کہہ رہی تھی کوئی بات نہیں کچھ مضائقہ نہیں، حالانکہ یہ جرم خون تھا لیکن یہاں کوئی بات ہی نہیں ہوئی تھی۔ اور پھر وہ تہذیب گری بات کسطرح کر سکتے تھے، جبکہ لڑکی کے ذاتی معاملات میں دخل دینا تہذیب سے ایک دم گری ہوئی بات تھی۔ پھر وہ اس کو کس طرح یہ بتانے کی جراءت کر سکتے تھے کہ تمہارے قدم غلط اٹھ رہے ہیں۔ اور پھر ان کو کسی کے غلط اقدام کی پرواہ بھی نہیں تھی، جبکہ وہ دنیا کی ساری ذمہ داری اپنی گردن پر نہیں لے سکتے تھے۔ اور وہ دوسروں کی ذمہ داری اپنی گردن پر کسطرح اٹھا سکتے تھے جبکہ وہ بڑے ہی نپے تلے اور حد درجہ کے سرد دماغ، تسلیم خو، اور سنجیدہ مزاج انسان واقع ہوئے تھے۔ اور پھر وہ کسی حالت میں بھی شک جیسی مسموم شے کو ذہن میں جگہ نہیں دے سکتے تھے اور کسی حالت میں بھی لڑکی کے مستقبل پر اپنے شکوک کا گہرا سایہ نہیں ڈال سکتے تھے۔ وہاں تو شادیاں ہو جاتی تھیں اور کچھ اسطرح ہو جاتی تھیں کہ والدین کو جرج کے ذریعہ پتہ چلتا تھا کہ آج ان کے قرۃ العین اور نورِ نظر کی شادی ہوئی ہے۔ اور ایسی باتیں وہاں کچھ نئی نہیں تھیں۔ رہی حالت یاسمین کی تو اگر یاسمین بھی اپنے والدین سے کہتی کہ میں شادی کر رہی ہوں تو والدین محض برحق کا نعرہ لگا سکتے تھے اور صرف سرِ تسلیم خم کر سکتے تھے۔ لیکن مجال نہیں جو پوچھ سکتے تھے کیوں اور کسطرح؟ اور اعتراض کی جراءت تو کبھی کر ہی نہیں سکتے تھے کیونکہ اس سلسلے میں ان کے پاس "ہاں" بھی نہیں تھا اور "نا" بھی نہیں تھا۔ اور اس قسم کی شادی کے واقعات بڑے

حسن وخوبی کے ساتھ آئے دن پیش آتے تھے۔ اور یہ ان کی تہذیب میں داخل تھے۔

تہذیب نے اگر اس قدر ترقی کر لی ہو کہ ایک نگاہِ غلط انداز کا مشاہدہ ہر رُخ اور ہر زاویہ سے صحیح نکلے پھر تو والدین کے یہ اطوار قابلِ ستائش تھے۔ لیکن اگر حالات اس کے برعکس ہوں تو مصیبت یہ ہوتی تھی کہ وہ کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔ حالانکہ یہ بات نہیں تھی تاہم ایک بات از روئے دلیل روشن تھی کہ شادی کے معاملات میں دخل دینے والے والدین فطرت کے کوئی ایجنٹ نہیں لہٰذا ان کی پوزیشن فطرت کی نگاہ میں جائز نہیں۔ چنانچہ ایک بات وہ کر سکتے تھے اور وہ یہ کہ بس اعتماد کے حربے کو استعمال میں لاکر ان معاملات سے بے تعلق رہ کر ان کا صرف پرسکون مشاہدہ کر سکتے تھے۔

حالانکہ ہماری اور یاسمین کی روزانہ ملاقات ہو جاتی تھی اور ہم بلاناغہ کم از کم دو گھنٹے آپس میں مل بیٹھتے تھے۔ اور اس روزانہ کی صحبت میں کون سے ایسے موضوع تھے جن پر ہم نے بحث نہ کی ہو۔ اور کون سے ایسے مسائل تھے جن پر ہم نے تبادلۂ خیال نہ کیا ہو اور پھر لطف یہ کہ ہر موضوع پر مکمل بحث اور کامل تبصرے ہوتے تھے۔ تصویر کے سارے رخ اور تمام زاویے پیش نظر ہوتے تھے۔ دقیق سے دقیق مشاہدے ہوتے تھے۔ باریک سے باریک تجزیے کئے جاتے تھے اور نازک سے نازک نکات نکالے جاتے تھے لیکن پتہ چلتا تھا کہ ہم لوگوں سے کبھی کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا تھا۔ اور باوجود سخت سعی و جانفشانی کے ہر موضوع تشنہ رہ گیا تھا پھر تو یہ سارا معاملہ پاگل پن کا ایک مظاہرہ تھا تاہم یہ معاملہ جب تک چلتا رہا بہت ہی خوب رہا۔ لیکن اب اس نے رفتہ رفتہ ایک ایسے مشغلہ کی صورت اختیار کر لی اور اس کی جگہ کچھ ایسے سلسلۂ گفتار نے لی جو الفاظاً موضوع کے لحاظ سے روزانہ دو گھنٹے کے تبادلۂ خیال کے متقاضی نہیں ہو سکتے تھے لیکن وہ تو شب و روز

کے بشیر اوقات پر چھاپہ مارنے لگے تھے۔ بالمشافہ تو باتیں ہوتی ہی تھیں لیکن سلسلۂ کلام کہاں ختم ہوتا تھا۔ اب تو یہ معمول ہو چلا تھا کہ دفتر میں ہوں کہ بستر میں، غسل خانے میں ہوں کہ مس میں، رفع حاجت میں ہوں کہ کھیل کے میدان میں ٹیلیفون تک نوبت پہونچتی تھی اور ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا تھا۔

"ہیلو۔ہیلو"، ٹیلیفون پر پکاریں اٹھتی تھیں۔

افسران اور اردلی حیران، کلرک اور چپراسی پریشان اور ایک بھاگم بھاگ کا سماں بندھ جاتا تھا۔

"فون۔فون"۔ پھر ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا تھا اور کلرک اور چپراسی بھاگتے نظر آتے تھے۔ اور اسی "فون۔فون" پر ایسی ہنگامہ آرائی ہوتی تھی کہ کبھی کبھی "خون۔خون"، کا گمان ہوتا تھا۔

ایک دن ان دیئے گئے احوال میں بھاگے بھاگے فون پر جو پہونچے تھے تو شک ہوا تھا مس یاسمین لائن کے دوسرے سرے پر رونق افروز ہیں، پوچھ رہی ہیں۔

"آپ کیسے ہیں؟"

یقین نہیں تھا کس کی آواز تھی۔ لیکن جان میں جان آئی تھی کہ ہماری خیرت پوچھی جا رہی تھی ورنہ یہاں خیرت کہاں؟ کامل یقین تھا کہ یہ ہیڈ کوارٹر کا فون ہے اور اس کمترین کو جزیرۂ سالموس کے مردآزما مہم میں بھیجے کا فرمان صادر کیا جا رہا ہے۔ جلدی جلدی جواب دیا گیا تھا۔

"میں خیریت سے ہوں۔ اور آپ؟"

جواب ملا تھا۔

"میری نہ پوچھیے۔ آپ صرف اپنی کہیے"

جواب سے ظاہر تھا۔ آپ بخیریت نہیں تھیں۔ طبیعت کسی قدر ناساز تھی اور اندازِ تکلم کہہ رہا تھا کہ اس سلسلے میں قصوروار خاکسار ہی تھا۔

"مس یاسمین۔ میں آجکل ٹیلیفون کے پاس بھٹکنے سے بھی ڈرتا ہوں"

ہم نے عرض کر دیا تھا اور ادھر فوراً قطع کلام کر دیا گیا تھا۔

"بھلا آپ ڈرینگے کیوں نہیں۔ یہاں جو شیر بیٹھا ہے جو آپ کو لائن پر سے مسلم اچک لے گا۔ کیا باتیں بناتے ہیں۔ میں سب کچھ سمجھتی ہوں"۔ ادھر ٹیلیفون کے تاروں پر ناراضگی کی ایک مبہم لہر دوڑ گئی تھی۔

"صاحبزادی معاف کیجیے گا" ہم نے عرض کر دیا تھا "بخدا یہ خوف دامن گیر نہیں۔ میں ٹیلیفون سے اس لیے ڈرتا ہوں کہ اسی بدبخت ٹیلیفون پر کسی وقت بھی یہ خبر آسکتی ہے کہ ہم ساموس کی مہم میں جانے کے لیے تیار ہو جائیں"

اور ادھر ایک ٹھنڈی سانس لی گئی تھی جو ریسیور پر محسوس کی گئی تھی۔

"میں تو ڈر ہی گئی تھی کہ تمہیں ٹیلیفون سے کیوں ڈر لگنے لگا۔ خیر۔ تو تم ساموس کیوں نہیں چلے جاتے" یاسمین نے صلاح بھی پیش کر دی تھی۔

"میں بھی لگے ہاتھ تمہارے ساتھ ساموس کی سیر کر آتی۔ کہو تو میں تیاری کروں؟"

لیجیے آپ اس وقت سرکار کی ترجمان بن گئی تھیں۔ ہمیں تلقین کر رہی تھیں کہ

ہم ساموس کیوں نہیں چلے جاتے اور خود کو جلا وطن کیوں نہیں کر لیتے اور اس پر طرہ یہ کہ آپ بھی اس سفر میں شرکت کریں گی گویا یہ ایک مہم نہیں بلکہ اچھی خاصی پکنک تھی۔ سخت حیران تھے۔

"دیکھیے۔ صاحبزادی۔ یہ طفلانہ باتیں اس حد تک ٹھیک نہیں، آپ ساموس کے بارے میں کیا جانتی ہیں؟" ہم نے جھنجلا کر سوال کیا تھا۔

اور ادھر جواب ندارد۔

"دیکھیے یہ ہنسی مذاق کا مقام نہیں" ہم نے یاسمین کو مطلع کر دیا تھا۔ "ساموس ایک خوفناک جزیرہ ہے۔ لگ بھگ ساڑھے تین سو میل دور ایجین سی کے مشرق جنوب میں واقع ہے۔ بحری راستہ ہے، سمندر ہے، موجیں ہیں، اور "مائنس" یعنی جان لیوا سرنگیں بھی بحر کی تہوں میں پوشیدہ ہیں۔ آیا خیال شریف میں!"

جواب ملا تھا

"تو کیا ہوا۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلتی اور تمہاری مصیبت بانٹ لیتی اور اس طرح تمہاری مصیبت میں بھی کچھ کمی واقع ہو جاتی۔ مجھے تو معلوم بھی نہیں تھا کہ ساموس کتنا دور ہے اور میں نہیں ڈرتی۔ تم کیوں ڈرتے ہو۔ میرے ساتھ چلو ڈر نہیں لگے گا!"

"زندہ باد۔ آپ اسی وقت لائن منقطع کر دیجیے" ہم سخت حیران ہوئے تھے "میں آپ سے بحث نہیں کر سکتا اس لئے کہ ٹیلیفون پر بحث نہیں کی جا سکتی۔ سمجھ گئیں آپ!"

"تو گویا آپ بالمشافہ بات کرنے کے لئے آرہے ہیں؟" یاسمین نے بڑی سادگی سے پوچھ لیا تھا۔

"جی نہیں۔ میں ہرگز نہیں آسکتا" ہم نے درشت لہجہ اختیار کیا تھا۔

"آئیں گے کیوں نہیں آپ ضرور آرہے ہیں" یاسمین نے طرح دی تھی "اور دیکھئے میں آپ کی راہ میں آنکھیں بچھا رہی ہوں"

"آپ کے خیال سے میں متفق نہیں" ہم نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

"اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ آپ آرہے ہیں۔ آئیے نا! ۔ بائی۔ بائی"

اور لائن کا سلسلہ منقطع کر دیا گیا تھا۔

اور یہاں ہماری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کریں۔ پھر تو شہر کو چل دیئے تھے۔ کیونکہ اس کے سوا میرے لئے کوئی جائے فرار نہیں تھی اور جب مغرور ہو کر شہر میں پہونچ گئے تھے تو یاسمین سے ملاقات بھی ضروری ہو گئی تھی چنانچہ جب ہم یاسمین کی خوابگاہ میں داخل ہوئے تھے تو دیکھا تھا اس سادگی مجسم کے وضع و انداز میں ایک شدید انقلاب آیا ہوا تھا دل کو اعتبار اور آنکھوں کو یقین نہیں تھا۔ دیکھا تھا آج ان کی زندگی میں پہلی دفعہ ان کے لبوں پر لپ اسٹک کی سرخی مچل رہی تھی اور کانوں میں دیدہ زیب آویزے چمک رہے تھے۔ فی الفور قدم رک گئے تھے۔ اختلاجِ قلب کا دورہ پڑا تھا اور ایک گلاس سرد پانی کی ضرورت پیش آگئی تھی۔ اور پانی نوش جاں کرکے ہی دل قرینے پر آیا تھا۔

"آج تم نے اپنی اس روایتی پاکیزگی اور شستہ سادگی کی یہ کیا مٹی پلید کرلی

اور ہمارے دل کی کیا حالت بنا دی ؟" زبان سے بے اختیار نکل گیا تھا۔

"نہیں شاید یہ آویزے پسند نہیں ؟ اب تم خود بتاؤ تمہیں کیا پسند ہے میں وہی پہنتی ہوں" یاسمین ایکدم سے مچل گئی تھی۔

اور ہم کیا جواب دیتے۔ لبوں کی زینت اگر لپ اسٹک نہیں ہوئے اور کانوں کی آرائش اگر آویزے نہیں ہوئے تو ساعدِ سیمیں کی زیبائش کیا ہوئے۔ میرے لئے کہنا محال تھا۔

عرض کر دیا تھا۔

"مجھے معلوم نہیں"

"تمہیں معلوم نہیں میں بتاؤں۔ اب میں زیادہ برداشت نہیں کر سکتی۔ یعنی تمہارا وہ تجاہلِ عارفانہ یا تم اسے اپنی اصطلاح میں کیا کیا کچھ کہتے ہو میرے لئے بہت زیادہ صبر آزما ثابت ہو چکا ہے۔ اب یہ سب کچھ نہیں چلے گا" یاسمین نے دھمکی دی تھی۔

"مارو گولی اس تجاہلِ عارفانہ کو" ہم نے بھی پہلو بچایا تھا "یہ باتیں پھر کبھی آرام سے ہونگی۔ اس وقت تم یہ بتاؤ ٹیلیفون پر ساموس کے سلسلے میں یہ نیا قصّہ کیا چھیڑ اٹھا۔ کوئی بات کانوں پڑی اور دیوانہ ہو گئے، کپڑے لتے چاک کر ڈالے اور راہ میں نکل گئے۔ کدھر ہے تمہاری ساموس جانے کی وہ تیاری ؟"

"تو کیا تیاری میں سال دو سال لگتے ہیں۔ ابھی تم کہو اور چٹکی بجاؤ اور

دیکھ لو منٹوں میں تیار ہوئی "، یاسمین نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا تھا " بستر اور اٹیچی سنبھالی اور نکل پڑے اور یہ جا وہ جا سامو میں پہونچ گئے۔ کیوں کب جانا ہے ؟ "

" اور یہ بستر اور اٹیچی آپ کی آخر وقت تک سنبھالے گا کون ؟ "، ہم نے ذرا وضاحت طلب کی تھی۔

" اس سلسلے میں ساری فکر مجھے ہونی چاہئیے آپ کو نہیں۔ لہذا آپ پوائنٹ پے بات کیجئے "، یاسمین نے ہم پر رعب ڈالنے کی کوشش کی تھی۔

" اور آگے چل کر جس وقت یہ سامان ان نازک ہاتھوں سے نہیں اٹھ سکیں گے تو ظاہر ہے خاکسار کی مفت خدمت حاصل کرلی جائے گی۔ یہ ایک پوشیدہ ارادہ ہے نا آپ کا!"، ہم نے مزید وضاحت چاہی تھی۔

" خیال فرمائیے گا، یہاں اپنے ساعد سیمیں پر کچھ نہ کچھ بھروسا ضرور ہے۔ خیر اس کے لئے آپ فکر نہ کریں۔ لیکن وقت بے وقت کی بات میں نہیں کہہ سکتی کیونکہ وہ ہنوز قبل از وقت ہے "، یاسمین کا پورا اور انداز حد درجہ دلربایانہ تھا۔

" اور ایک بات واضح رہے۔ مجھے آپ " آپ "، نہ کہیں بلکہ " تم " کہیں اور اگر " تو "، کہیں تو بدرجہا بہتر ہے۔ کیونکہ یقینی طور پر بلحاظ عمر میں آپ سے چھوٹی ہوں اور یہ بھاری بھاری القاب میری سماعت پر کسی قدر گراں گذرتے ہیں "، ——————— یاسمین اترائی تھی۔

"اور آپ سا موس نہیں جائیں گی۔ اس لئے کہ میں احکام کی تنسیخ کی کوشش میں ہوں" ہم نے ان کو مزید آگاہ کر دیا تھا۔

"پہلی حالت میں نہیں۔ بشرطیکہ آپ بھی نہیں گئے۔ اور دوسری حالت میں ہاں۔ اسلئے کہ یہ طے شدہ بات ہے کہ اگر آپ کو جانا ہی پڑا تو مجھے بھی جانا پڑے گا" یاسمین نے ہمیں متنبہ کر دیا تھا۔

"آپ اس دوسری حالت میں بھی نہیں جا سکتی! اور آپنے یہ طے کس سے کیا ہے؟" ہم نے اس سے استفسار کیا تھا۔

"میں نے خود طے کر لیا ہے اس لئے کہ تھوڑا بہت فیصلہ کرنے پر میں خود بھی مختار ہوں۔ آپ جان رکھیں" وہ ایکدم سے اڑ گئی تھی۔

"تو تم فیصلہ کرتی رہو۔ میں اب کچھ نہیں کہتا۔ مجھے اجازت دو۔ خدا حافظ!"

اور ہم رخصت ہو گئے تھے۔

اور یاسمین دروازے پر حائل تھی۔

"یوں نہیں جا سکتے۔ اوپر سے چلے جائیے!"

"کس کے اوپر سے؟"

"میرے اوپر سے!"

"تم سمجھتی کیوں نہیں؟"

"میں سب کچھ سمجھتی ہوں!"

"بالکل درست! اچھا مجھے اجازت دو؟"

"پہلے آپ میرا مطالبہ منظور کیجئے"

"چلو منظور کیا"

"بہت جلدی آپ مان جاتے ہیں!"

"تم کچھ نہیں سمجھتی ہو!"

"آپ کبھی کچھ نہیں سمجھتے۔ اور دیکھئے۔ کچھ لپ اسٹک کی سرخی آپ اپنے ہمراہ مستعار لئے جا رہے ہیں اسے صاف کر لیجئے"

"وہ تمہارے ہاتھ سے لگی ہے"

"لیکن معاف کیجئے گا۔ آپ کا یہ عذر دیکھنے والے کبھی تسلیم نہ کریں گے۔ بائی۔ بائی۔ چیریو!"

—— ۱۱ ——

حالانکہ اگر ہم چاہتے تو اپنے ذاتی مراسم اور رسوخ کو استعمال میں لا کر احکام کی تنسیخ کرا سکتے تھے۔ لیکن درحقیقت ہم نے احکام کی تنسیخ کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا۔ کیونکہ ہم عادتاً زندگی کے میدان میں سر بکف تھے۔ اور یہ بات تو اپنی فطرت سے بعید تھی کہ اپنے جیسے انسانوں کے آگے دست مدعا دراز کرتے کیونکہ یہ سراسر اپنی ذات کی توہین تھی۔ اور حرفِ شکایت تو زبان پر لا ہی نہیں سکتے تھے کہ زبان اس کی متحمل نہیں تھی اور پھر اپنے جیسے انسانوں کے پاس ہم شکوہ کیوں کرنے جاتے جبکہ فی الحقیقت ہم ان کو کفِ خاک سے زیادہ مجبور سمجھتے تھے۔ لہٰذا ہمیں اپنے فرض کا شدید احساس تھا اور اس کی انجام دہی میرے لئے سب سے اہم بات تھی۔ اور چونکہ عزم اور ہمت اس وقت عالم بالا کی نشاندہی کر رہی تھی لہٰذا ہم احساس کا ایک شدید طوفان پہلو میں لئے ہوئے ساموس کی مہم میں نکل پڑے تھے۔ ہم نے یاسمین کو مطلع کرنا ضروری

نہیں سمجھا تھا۔ اس لئے کہ وہ عقل سے زیادہ جذبات سے کام لیتی تھی۔ اور اس کو
اس قسم کی اطلاع بہم پہونچانا گویا اپنی بیوقوفی کا مظاہرہ کرنا تھا۔ پھر تو ہم نے دا اسکوڈا
گاما کی طرح ایک لق ودق اور پر آشوب سمندر میں اپنے کو جہاز کے سپرد کر دیا تھا۔
اور بائیس واعیں کا کھٹکا دل سے ایک دم نکال پھینکا تھا۔ اور جہاز بھی بے خطر
چل پڑا تھا سمندر سخت متلاطم تھا اور اس کی تہ میں اور سطح میں خونخوار شارک اور
دیگر حشرات البحر تیر رہے تھے اور اس کے گہوارے میں ہولناک اور ہلاکت
آفریں سرنگیں بھی کروٹیں لے رہی تھیں۔ آٹھ ہزار ٹن کا جہاز موجوں کے طلاطم میں
اور لہروں کے تھپیڑوں میں پر کاہ کی طرح چھپتا تھا۔ امواج اسے مسلسل بے راہ
کئے ہوئے رہتے تھے اور سخت دشواری کا سامنا تھا کہ جہاز کو مشرق جنوبی سمت رہنے
کے بجائے کبھی کبھی سیدھے جنوب کی جانب رخ کرنا پڑتا تھا۔ رخ میں یہ تبدیلی
اس لئے پیش آئی تھی کہ امواج کی موافقت یا پھر مخالفت ضروری تھی۔ یہ جہاز رانی
کی اپنی تکنیک تھی اور تکنیک کے لحاظ سے یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ البتہ ہمارے لئے
فرق اتنا پڑا تھا کہ اس تبدیلی سے مسافت میں مقرر اضافہ ہوا تھا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ جو بیس
گھنٹے کی مسافت اڑتیس گھنٹے میں طے ہوئی تھی لیکن سفر کی جاں کاہیاں دگنی ہوگئی تھیں
اور ادھر ہم نے اپنا سامان کیبن میں لگوا دیا تھا کہ ہماری نگاہیں حیرت میں کھلی کی کھلی
رہ گئی تھیں اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے آن کر رک گئی تھی دیکھا تھا کہ یہ کین
ہمارے مقابل کی کیبن میں کھڑی تھی۔ ایک فریاد خاموش لبوں پر تھی اور زبان کی
تاب گویائی چھین گئی تھی۔ سمندر اسقدر متلاطم تھا کہ لہریں کبھی کبھی ڈک کو چھوتی تھیں
اور کیبن کے کچھ حصے پر حسرت لگاتی ہوئی موجیں جھاڑو پھیر جاتی تھیں اور

موجوں کے اتار چڑھاؤ میں جہاز کچھ ایسا رقص کر رہا تھا کہ کلیجہ منہ کو آجاتا تھا۔ کبھی
موجوں کی بارش ہوتی تھی اور کبھی اڑنے والی مچھلیوں کی بوچھاڑیں آتی تھیں اور وہ ہر سو
اور ہر جانب فرش سے لیکر برتھ تک تڑپتی نظر آتی تھیں۔ سخت غصہ آیا تھا اور تیرتے
ہوئے قدموں سے چلکر ہم نے یاسمین کی کلائی پکڑلی تھی اور اس کو کھینچ کر اپنے برتھ میں
لے آئے تھے اور نہ جانے اس کھینچ تان میں یاسمین کے ڈیڈی بھی کدھر سے اپنے کیبن کے
ایک گوشے سے برآمد ہوگئے تھے۔ اب تو ہم سکتے میں آگئے تھے۔ یہ تو وہی قصہ ہوا تھا۔
"یک نہ شد دو شد" اور ادھر پیر بزرگوار ہماری تائید کر رہے تھے کہ ہم نے ٹھیک ہی کیا کہ
یاسمین کو کھینچ کر اپنے کیبن میں لے گئے" اس لئے کہ اسے اس وقت تیمارداری کی ضرورت
تھی۔ اور ان کے حسب حکم ہم یاسمین کا بستر بھی ہوا میں تیرتے ہوئے اٹھا لائے تھے
اور جب حضرت کو اپنے برتھ میں لانے کے لئے دوبارہ گئے تھے تو حضرت نہیں آئے
تھے وہ تو سٹ مار کر بستر پر دراز ہوگئے تھے اور جہاز کے اتار چڑھاؤ کے پیش نظر
ان کا یہ رویہ خالی از مصلحت نہیں تھا۔ لیکن یاسمین کی حالت ابتک غیر ہو چکی تھی۔
سر چکرا رہا تھا طبیعت نڈھال اور مضمحل تھی اور تے پر تے آرہی تھی اور ہمارے ابکائیوں
کے برا حال تھا اور اپنے جسم کے کپڑوں سے لیکر برتھ تک آلودہ تھے۔ یہ کچھ یاسمین ہی پر موقوف نہیں تھا
یہاں تو الا معدودے چند کے سارے لوگ اس بلا میں گرفتار ہوئے تھے۔ ابکائیوں کی ابتدا جو کسی
نے خیر سے کردی تھی تو نتیجہ یہ ہوا تھا کہ باقی ہم غریبوں کی خیر نہیں تھی سارے کے سارے یکے بعد دیگرے اسکی
تقلید کرنے لگے تھے پھر تو ابکائی اور تے کا وہ دور شروع ہوا تھا کہ نمبر وار مشق شروع ہوگئی تھی اور یہ مشق
مکمل دو گھنٹے تک جاری رہی تھی۔ پھر خدا خدا کرکے سمندر کسیقدر ساکن ہوا تھا۔ یاسمین ذی فرش بنی تھی
اسکے سر کے بال بے ترتیب کپڑے ملگجے تھے اور مارے نقاہت کے چہرا اترا ہوا تھا۔ اور اپنی بھی طبیعت کچھ۔

بہتر نہیں تھی لیموں اور دوسری تُرش چیزوں کے استعمال سے اس کی اور پھر اپنی طبیعت کسی قدر سنبھل گئی تھی اور ہمیں کسی قدر اطمینان ہوا تھا کہ بلا ٹل گئی۔ پھر حضرت بھی خرہ اماں خراماں ہمارے برتھ میں تشریف لائے تھے اور اس وقت ہم بھی خوش تھے اور بحد خوش تھے۔

دوسرے دن یاسمین جہاز کے کوارٹر ڈک پر تھی۔ ریلنگ کے سہارے کھڑی تھی اور ساکن سمندر کا مشاہدہ کر رہی تھی اور جہاز سمندر کے نیلگوں چادر کو پھاڑتا ہوا چلا جا رہا تھا اور نسیم سحر کے ہلکے ہلکے جھونکے یاسمین کے سنہرے بالوں کو چھیڑتے جا رہے تھے۔ اور یہ دراصل نسیم سحر کے جھونکے نہیں تھے جو گستاخی کر رہے تھے۔ بلکہ جہاز کی رفتار کے جھونکے تھے کیونکہ ہوا اس وقت متحرک نہیں تھی اور دور دور افق تک سمندر اسقدر ساکن تھا کہ اس کی سطح ایک ردائے نیلگوں کی طرح بچھی تھی جس پر کہیں کوئی شکن یا سلوٹ نہیں نظر آتی تھی۔ سہانا سہانا وقت تھا۔ طلوعِ سحر کے مناظر حدِ نگاہ میں تھے۔ گنبدِ نیلگوں کے نیچے نیلگوں سمندر میں جہاز ایک سمت چلا جا رہا تھا۔ اس وقت ماحول اور وقت اس قدر سحر آفریں تھا کہ غزل کہنے کو جی چاہ رہا تھا لیکن یاسمین چونکہ سراپا غزل بنکر سامنے کھڑی تھی لہذا غزل کہنے کی مزید ضرورت نہیں تھی۔ لیکن اس وقت تو وہ ایک خاموش غزل تھی۔ چنانچہ اس کو متکلم کرنے کے لئے ہم اس کے پہلو پر جا کھڑے ہوئے تھے اور اس کے شانے کو کسی قدر ہلا دیا تھا۔

"مس یاسمین۔ اندازہ ہے تمہاری طبیعت اب بالکل ٹھیک ہے؟"
ہم نے اس کی مزاج پرسی کی تھی۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں میری طبیعت اب بالکل ٹھیک ہے" اس نے جواب

دیا تھا " اور آپ کی ؟ "

" میری چھوڑو ۔ اب تم یہ بتاؤ تمہارا یہ عزم سفر کہاں کا ہے ؟ " یہ بات ہم یاسمین سے بہت پہلے ہی دریافت کرنا چاہتے تھے ۔

جواب کے بجائے یاسمین کے لبوں پر پہلے تو ایک ہنسی نمودار ہوئی تھی جو دراصل نہایت پھیکی تھی ۔ لیکن چونکہ وہ اپنی طبیعت کے بیساختہ پن سے مجبور تھی لہذا طبیعت کی تیزی جسمانی نقاہت پر غالب آگئی تھی اور وہ بھلے چنگے کی طرح بات کرنے لگی تھی ۔

" آپ جان کر کیا کیجئے گا ۔ عزم سفر کوئی خاص بھی نہیں البتہ ہم اپنی آنٹی کے یہاں جا رہے ہیں " ۔ یاسمین نے جواب دیا تھا ۔

" اور تمہارے ڈیڈی بھی شاید وہیں جا رہے ہیں ؟ "

" ڈیڈی بھی وہیں جا رہے ہیں ۔ کیوں آپ کو کوئی شک ہے ؟ "

" بیشک مجھے شک ہے ۔ اور تمہاری یہ ساری باتیں سفید جھوٹ ہیں ! "

" دیکھئے جناب ویسے مجھے آپ جو کچھ کہہ لیجئے لیکن جھوٹی نہ کہئے ورنہ مجھے غصہ آسکتا ہے "

" کچھ زن مرید قسم کے لوگ اب تک دنیا میں آباد چلے آرہے تھے لیکن تمہارے ڈیڈی کچھ " دختر مرید " قسم کے آدمی نکلے " ہم نے یاسمین کو ملامت کی تھی " تم نے ان کے کان میں کچھ کہہ دیا اور انہوں نے آگے دیکھا نہ پیچھے سیدھے نکل پڑے تمہاری آنٹی کے یہاں ۔ کہاں ؟ ساموس ! ہمیں اچھی طرح معلوم ہے ساموس میں تمہاری کوئی آنٹی وانٹی نہیں "

" اچھا ۔ تو اب آپ ہمارے ڈیڈی کو " دختر مرید " کہنے لگے ہیں ۔ خیر آپ سے

پہنٹ لوں گی کبھی!،،

"اور آپ سن لیجئے۔ آپ لوگ آنٹی وانٹی کے یہاں نہیں جارہے ہیں بلکہ وہاں جارہے ہیں جہاں میں جھک مارنے جارہا ہوں،،

اور یہاں آنٹی وانٹی کا سلسلہ ہی غلط تھا یہاں قصہ تھا فقط سپرد سفر کا۔ یوں تو دنیا کے بیشتر حصے میں زن و مرید قسم کے شوہر ہی اب تک آباد چلے آرہے تھے، لیکن بیسویں صدی کے فیض سے آجکل بکثرت "دختر مرید" قسم کے باپ یا ڈیڈی بھی نظر آجاتے ہیں۔ وہ ڈیڈی اپنی لڑکیوں کے حق میں ایک نعمت ہوتے ہیں اور کچھ اسطرح کے مشفق اور مہربان قسم کے ڈیڈی ہوتے ہیں کہ ان کی جوان لڑکیاں ان کے سر پر سوار ہوتی ہیں اور ان کے گھٹنوں لگے بیٹھتی ہیں اور ان سے اس قدر وابستہ ہوتی ہیں کہ وہ ان کے ڈیڈی کے بجائے ممی کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں۔ اور سچ پوچھئے تو ممی سے ان لڑکیوں کو للٰہی بغض ہوتا ہے اور وہ ممی کی صورت سے بھی بیزار نظر آتی ہیں۔ ان لڑکیوں کی ہر بات اور ہر ضرورت کا خیال ڈیڈی ہی کو ہوتا ہے۔ ڈیڈی ان کی آرائش و زیبائش کے جملہ سامان کے مہتمم اور محافظ ہوتے ہیں۔ ڈیڈی ان کے بال سنوارتے ہیں، ان کی مانگیں نکالتے ہیں، ان کے فراک کے بند باندھتے ہیں اور ان کی جوتیاں تک سیدھی کرتے ہیں۔ ان کی اناڑی سے اناڑی اور الہڑ سے الہڑ فرمائشوں کی تعمیل کرتے ہیں، اور ان کے چشم و ابرو کے ایک ایک اشارے پر رقص کرتے ہیں۔ اور پھر فرزندِ نرینہ کی جانب سے یہ ڈیڈی اس قدر سرد ہوتے ہیں کہ وہ ان کو منہ نہیں لگاتے اور وہ فرزندِ ارجمند بھی ان سے صاف بھاگتے نظر آتے ہیں۔ پھر اس قسم کے فرمانبردار اور نیاز مند ڈیڈی کسی سرچڑھی لڑکی کو مل جائیں تو وہ جو کچھ بھی کرے

کم ہے۔ مختصر یہ کہ اسی قسم کے ایک فرمانبردار ڈیڈی یاسمین کو مل گئے تھے اور پھر اس ڈیڈی کو بھی قدرت نے یاسمین میں اسی قسم کی ایک سرچڑھی لڑکی عطا کر دی تھی۔

یاسمین نے بھی کہہ دیا ہوگا ڈیڈی چلو سیر کو چلتے ہیں اور ڈیڈی نکل پڑے تھے۔ پھر ڈیڈی کو جہاز بھی نظر آیا تھا۔ اور چونکہ لڑکی نے کیبن میں سیٹ ریزرو کرا لیا تھا لہذا ڈیڈی جہاز پر بھی بیٹھ گئے تھے اور جہاز پر جو ایک دفعہ بیٹھے تھے تو سمندر بھی نظر آگیا تھا اور پھر بعد کو پتہ چلا تھا کہ یہ بھی VOYAGE یا سفر میں جا رہے ہیں۔ اور پھر چلے بھی جا رہے تھے چنانچہ آپ تھے ایک فرمانبردار ڈیڈی جن کو اس وقت جہاز پر کوئی بھی دیکھ سکتا تھا۔ چنانچہ آپ چلے جا رہے تھے۔ اور ہم بھی چلے جا رہے تھے۔

اور آج اس وقت جہاز پر ہماری دوسری سحر تھی اور جہاز حسب دستور اپنی منزل طے کرتا جا رہا تھا۔ یاسمین۔ ڈیڈی اور ہم کافی میز کے گرد بیٹھے کافی پی رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ آج کسی وقت جہاز بندرگاہ پر لگے گا۔ پھر ہم جہاز سے اتریں گے اور ایک نئے شہر میں ہوں گے۔ شہر کی سیر کریں گے اور نئی نئی چیزیں دیکھیں گے۔ اور پھر بات چیت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ یاسمین نے رسمی طور پر کچھ بات چیت شروع کی تھی

"آپ کا تو میں شکریہ ادا کرنا بھول ہی گئی۔" یاسمین نے کافی کی ایک چسکی لیتے ہوئے ایک نئی بات شروع کی تھی۔

"میرا شکریہ؟ لیکن اتنی جلدی بھی کیا۔ پھر کبھی ادا کر لینا۔ تم اس وقت کافی پیو" ہم نے بھی کافی کی ایک چسکی لی تھی۔

"واہ۔ آپ نے میری کس قدر تیمارداری کی ہے۔ اور میں شکریہ بھی ادا نہ کروں"

"لیکن یہ کوئی بہت بڑی بات بھی نہیں ۔ اور آپ مجھے شرمندہ نہ کریں"۔

"بڑی بات کیوں نہیں ۔ ضرور بڑی بات ہے ۔ آپ جیسے تیماردار اگر ساتھ ہوں تو انسان بیماری کو صحت پر ترجیح دے سکتا ہے"، یاسمین نے تو واقعی ہمیں شرمندہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور پھر ڈیڈی سے بھی تائید طلب کی تھی۔

"معاف کیجیے گا۔ مس یاسمین ۔ آپ بیمار کب ہوئی تھیں کہ تیمارداری کا تذکرہ ہے"، ہم نے ٹوک دیا تھا۔

"تیمارداری کا تذکرہ نہ کروں ۔ آپ نے میری بڑی خدمت کی ہے۔ اس کے صلے میں تو مجھے آپ کی تاعمر خدمت کرنی چاہیئے"، اس نے بڑی بھاری بات کہہ دی تھی اور ہم نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا اور اسنے میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور ڈیڈی ادھر رخصت ہو گئے تھے ۔ آپ جہاز کے انجن روم کیطرف چلے جا رہے تھے۔

"دیکھو یاسمین میں کسی لائق نہیں۔ اور تم ایسی باتیں آئندہ نہ کرنا ورنہ جہاز بھی رک جائے گا"۔

"جہاز رکا کرے ۔ آپ لائق و فائق ہیں۔ اور آپ مجھ سے آئندہ اس قسم کی باتیں نہ کریں ورنہ ٹھیک نہیں ہو گا"۔

اور اس دھمکی سے تو ہم واقعی سہم گئے تھے کہ لڑکی سخت نازک مزاج تھی اور پھر وہ تھی یاسمین۔

ہم سخت مصیبت میں گرفتار ہوئے تھے۔ ادھر ادھر دیکھنے لگے تھے کہ کاش ایک دفعہ وہ حضرت ڈیڈی ہی نظر آجاتے اور انہیں بلا لیتے۔ لیکن وہ تو اس سین سے دور نکل

گئے تھے۔ اب کیا کریں کہ سامنے فضا میں اڑتے ہوئے طیور نظر آ گئے تھے اور موقع کو غنیمت جان کر ہم نے یاسمین کا دھیان اسی جانب مبذول کرنے کی کوشش کی تھی۔

"یاسمین۔ وہ دیکھو۔ فضا میں طیور اڑ رہے ہیں اور وہ اس بات کی دلیل ہیں کہ اب کنارہ دور نہیں۔ لہٰذا چلو سامان باندھ لیں" ہم نے یاسمین کا ہاتھ کھینچا تھا۔

اور یاسمین نے ہمارا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔

"نہیں سامان نہیں بندھیں گے۔ آپ پہلے اس بات کا عہد کیجیے کہ پھر کبھی قنوطیت آمیز باتیں نہیں کریں گے۔ تبھی سامان بندھیں گے ورنہ نہیں"۔ اور وہ سمٹ کر بیٹھ گئی تھی۔

"چلو عہد کر لیا۔ اب تو سامان بندھیں گے"

"نہیں ایسے نہیں۔ آپ سنجیدگی سے اس طرح عہد کیجئے کہ خدا کو حاضر و ناظر جان کر عہد کرتا ہوں کہ جیتے جی کبھی مایوسانہ گفتگو نہیں کروں گا"۔ یاسمین نے حلف کی بھی صورت پیش کر دی تھی۔

اور ہم اس سرچڑھی لڑکی سے کس طرح پار پا سکتے تھے۔ البتہ اس کے ڈیڈی کی طرح سرِ تسلیم خم کر کے ہی چھٹکارہ پائے تھے۔

"چلو اس طرح بھی عہد کر لیا"

اور عہد بھی بے چون و حجت کر لیا تھا درآنحالیکہ ہم فطرتاً قنوطیت پسند تھے نہیں۔ قصہ مختصر سامان بندھ گئے تھے۔ سامنے بندرگاہ تھی اور ایک حسین و جمیل شہر اس کے پس منظر میں جھانک رہا تھا۔ اور یہ تھا سلوس۔ شہر کوہستان کا ایک منظر!—

۲-

جذبات کی دُنیا ۔

حالانکہ لڑکیاں جب اپنی عمر کی ٹین (TEEN) میں یعنی تیرہ[۱۳] سے لیکر انیس[۱۹] کے سِن میں ہوتی ہیں وہ جنسی لحاظ سے سرد ہوتی ہیں اور رفتہ رفتہ ایک عورت اپنی تیسوں[۳۰] کی حدوں میں ہی پہونچ کر جنسی جذبات کی شدت کو پہونچتی ہے اور بقولِ حکماء اس کی یہ صلاحیت اس کی ساٹھ[۶۰] سے کچھ آگے تک باقی رہتی ہے اور پھر اس سے آگے چل کر وہ بالکل ہی سرد پڑ جاتی ہے۔ لیکن لڑکوں کے لئے یا پھر مرد کے لیے ان کی عمر کی ٹین ہی میں ان کے جنسی جذبات کے ارتقا کی ساری حدیں ختم ہو جاتی ہیں اور ان حدود سے وہ جیوں جیوں تجاوز کرتے جاتے ہیں لاشعوری طور پر ان کے جذبات بتدریج سرد پڑتے جاتے ہیں۔ تاہم جذبات میں یہ عدم مساوات یا تضاد دشمنی کا باعث نہیں، اس لئے کہ یہ تضاد جنسی کشیدگی کا باعث ہے جو در اصل من جانبِ قدرت بقائے باہمی کی ایک ترکیب ہے۔

لڑکیاں جب اپنی عمر کی ٹین میں ہوتی ہیں اس وقت ان کے شعور میں پختگی بالکل ہی نہیں ہوتی۔ حالانکہ اس عمر میں وہ اسکولوں یا کالجوں میں تعلیم پاتی ہیں اور ان کی ذہنی اور وجدانی نشست ونشو کا سلسلہ بخوبی جاری رہتا ہے اور اس کے فیض سے ان کی سمجھ

میں صفائی اور فکر میں نکھار کی توقع کی جاتی ہے لیکن ان کے سارے شعور نہیں نکھرتے اور پھر ان کے تمام تر احساس بیدار نہیں ہوتے۔ پھر تو وہ زندگی کے نشیب و فراز سے ایکدم ناواقف ہوتی ہیں اور اسقدر ناسمجھی اور الہڑپنے کا مظاہرہ کرتی ہیں کہ ان کی اچھی خاصی تعلیم کو موردِ الزام ٹھہرایا جاتا ہے۔ ابتک انہوں نے کتابیں ہی پڑھی ہیں۔ ایک سے ایک کتابی درس انہیں یاد ہیں لیکن وہ کبھی جو بھولے بھٹکے زندگی کے میدان میں اتر آتی ہیں اور زندگی کی دوڑ میں قدم رکھنے لگتی ہیں تو وہ سارے کتابی درس بالائے طاق رکھ اپنی ٹھیٹھ نسوانیت پر اتر آتی ہیں اور بے دیکھے ایک کتابی چہرے کے سہارے اس نئی منزل کو طے کرنے لگتی ہیں۔ اور ایسی ایسی منہ کی کھاتی ہیں کہ طبیعت صاف ہونے لگتی ہے۔ اس سلسلے میں ان پر وہی بات صادق آتی ہے کہ تعلیم کے سمندر طے کر گئے لیکن عقل کی گنگا میں آکر ڈوبے۔ وہ تو ڈوبتی ہی ہیں لیکن کبھی کبھی کسی کو اپنے ساتھ کچھ اسطرح لے کر ڈوبتی ہیں کہ اسے تمام عمر پانی پلاتی رہتی ہیں۔ کچھ اس قسم کی بات اس مغربی لڑکی کے ساتھ پیش آئی تھی جس سے اس کی تعلیم بھی بدنام ہوئی تھی۔

دراصل اس عجیب الخلقت لڑکی کا سلسلہ کچھ اسطرح ہے کہ وہ چندے ماہتاب اور چندے آفتاب اپنی ذات میں بلا کی جاذبِ نظر اور غضب کی دل چھین قسم کی لڑکی واقع ہوئی تھی۔ حالانکہ اول اول اس کی سحر کو شرمندہ کرنے والی سادگی اور پاکیزگی کا کچھ ایسا سحر اپنی نگاہوں کے آگے ٹوٹا تھا کہ ہم اس کی چال ڈھال اور خد و خال میں یدِ قدرت کی نزاکت ہی کا تماشہ دیکھ رہے تھے لیکن دیکھتے دیکھتے اس نے کچھ ایسے بال و پر نکالے تھے کہ ساری سادگی اور پاکیزگی ایک دم سے رخصت ہو گئی تھی اور دنیا ایک سے ایک جلوہ نظر آیا تھا موجِ رنگ کا اور سب کچھ دھوکہ ہی دھوکہ ثابت ہوا تھا

اور اب جو ہم نے اسے ملاحظہ کیا تھا تو وہ صبحِ بہار گل بداماں اور گلستاں بہ کنار دکھلائی دیتی تھی اور اپنے اردگرد برق گراتی اور آگ لگاتی نظر آتی تھی۔ قدرت کی طرف سے وہ دیدہ زیب اور نظر فریب بنائی گئی تھی لیکن وہ فارغ بیٹھنے والی کب تھی وہ تو اپنی صحت کی خاطر بال بال کی آرائش سے اور خال خال کے میک اپ سے کچھ دو قدم آگے ہی نکلنے کے پھیر میں تھی۔ حالانکہ اس قسم کی لڑکیاں فطرتاً بلند اور بے نیاز ہوا کرتی ہیں اور وہ اس قسم کی آرائش اور زیبائش کو ایک فضول سی چیز قرار دیتی ہیں۔ اور یہ ایسے کوسوں دور بھاگتی ہیں، لیکن خدا جانے اسے آرائش اور زیبائش کی کونسی نئی لت پڑ گئی تھی کہ اگر وہ ایک دفعہ اپنے خدوخال اور یہ وبال کو قرینے سے نہ سنوارتی تو اپنی ذات میں ایک کمی محسوس کرتی۔ اور یہ سب کچھ قدرت کے کاروبار میں ایک ناجائز دست اندازی نظر آتی تھی۔ اور یہ کچھ اچھا نہیں لگتا تھا درآنحالیکہ اس کے چہرے کی قدرتی صفائی اور فطری سادگی صبحِ بہار کو دعوت دے رہی تھی اور اپنے بانکپن میں سحر کے تارے توڑ رہی تھی اور ایسے نظارہ فریب حسن پر میک اپ کرے کر زیور کی آرائش اس کے حسنِ جہاں سوز کی تخفیف ہی تخفیف نظر آتی تھی۔ اور پھر اسطرح جو وہ میک اپ کے ایک سے ایک خطرناک اسلحہ سے مسلح ہوتی جاتی تھی تو ہم اپنے اردگرد دیکھنے پر مجبور ہوئے تھے کہ وہ کون اہلِ دل ہے جس کی شامت آئی ہے۔ لیکن اس کے آس پاس اپنے سوا کوئی اس کی زد میں آتا نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن ہم مطمئن تھے کہ ہنوز جارحیت شروع نہیں ہوئی ہے اور کوئی ضروری نہیں کہ برق اس جانب ہی گرے۔ لیکن یہاں احتجاج کرنے کو جی چاہتا تھا اور طبیعت میں بسا اوقات آتی تھی کہ عزم کے ساتھ بڑھ کر اس کے

میک اپ میں اٹھے ہوئے ہاتھوں کو روک لیں۔ کنگھی اس کے ہاتھ سے چھین لیں۔ غازہ اسنو اور کریم کی ساری شیشیوں کو پیک کر کے کسی فلم اسٹوڈیو کے نام پر پارسل کر دیں۔

لیکن وہی بات۔ یعنی کہ وہ جو کچھ کیمرے آپ کیوں خیاباں خیاباں سیر کر رہے ہیں اور اپنا دامن جھاڑیوں میں الجھا رہے ہیں۔ اور پھر ادھر اسٹائل کا یہ عالم تھا کہ کبھی سنہرے بال آزادی کے ساتھ پشت پر لہراتے ہوتے، کبھی ایک ہی حلقے میں اسیر بال پیچھے اڑتے ہوتے۔ کبھی زلفوں کے اردگرد سفید ربن کا حلقہ پڑا ہوتا۔ اور کبھی لالہ وگل جوڑے کے اردگرد کھل رہے ہوتے۔ اس حالت میں اگر اسے کوئی ایک دفعہ دیکھ پاتا تو اسے معلوم ہوتا کہ اس نے گویا کوئی رنگین خواب دیکھا ہے۔ اور اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور دوسری دفعہ وہ اپنے اردگرد دیکھنے پر مجبور ہوتا اور وہ سمجھ جاتا کہ ماحول ہی حسین اور منور ہے اور کسی قدر مجرمانہ ہے۔ لہذا اس سے اگر کوئی لغزش سرزد ہو گئی تو اسکے لئے وہ ذمہ دار نہیں۔

ہر چند وہ ایک بارعب اور سخت گیر قسم کی لڑکی دکھلائی دیتی تھی اور بظاہر بڑی سنجیدہ اور رنجی تُلی سی نظر آتی تھی لیکن اس کی نگاہیں کسی قدر مضطرب نظر آتی تھیں۔ حالانکہ اول اول اس کی خاموشی کو ہم نے غنیمت جانا تھا لیکن آگے چل کر پتہ چلا تھا کہ یہ خاموشی فی الحقیقت بے ساختہ نہیں بلکہ خود ساختہ تھی اور متجسس نگاہیں کچھ ایسی داستان کہہ رہی تھیں کہ ان نگاہوں سے کسی قدر ڈر لگا تھا اور جلد پتہ چل گیا تھا کہ وہ اپنے زعم میں خاکسار کے بارے میں کچھ اچھی رائے نہیں رکھتی ہے۔ اچھی رائے کچھ اس لحاظ سے نہیں رکھتی تھی کہ خاکسار کی جانب اس کے خیالات کچھ خطرناک قسم کے نظر آتے تھے حالانکہ یہاں اس بات کے جاننے کی کوئی ضرورت نہیں تھی کہ وہ کیا سوچتی ہے یا وہ اپنے ذہن میں کسی کے بارے میں کیسی رائے یا اپنے دل میں کیسے جذبات رکھتی ہے باوجود

اس کے یہ ساری باتیں اپنے لئے ایک درد انگیز اشتیاق کا موجب بن رہی تھیں۔ اور
پھر اتفاق کچھ ایسا کہ اس سے ہر شام ملاقات ہو جاتی تھی اور اس ملاقات کے فیض
سے یہاں روز افزوں خطرے میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ اور اس پے در پے خطرے
کے باوجود کچھ احتیاط بھی نہیں برت رہے تھے حالانکہ اگر چاہتے تو فرار بھی ہو سکتے تھے۔

بارہا ہم نے دیکھا تھا وہ ڈرائنگ ٹیبل پر ہوتی اور کچھ ڈرائنگ بناتی ہوتی۔
کبھی لالہ و گل کا خاکہ اڑاتی ہوتی، کبھی چاند چکوری کا رومان چراتی ہوتی۔ کبھی قمری
بلبل کے پر کترتی ہوتی اور کبھی انسان کی شبیہ کی حجامت بناتی ہوتی۔ اور کبھی کوئی شریر
چھوٹی لڑکی اس کا بنایا ہوا خاکہ اس کے ٹیبل سے اچک لیتی اور اس کا وہ تعاقب
کرتی نظر آتی۔ لیکن چونکہ آڑے ترچھے قدموں سے بھاگتی ہوئی شرارت کی پرکالہ
کسی چھوٹی لڑکی سے کسی جوان دوشیزہ کا نپٹ لینا ذرا آسان کام نہیں لہذا اس دوڑ
میں وہ شکست کھا جاتی اور تھک کر چار و ناچار ڈرائنگ ٹیبل پر پھر سے آن بیٹھتی
اور لمبی لمبی سانسیں لیتی ہوتی۔ اور ڈیڈی سے شکوہ کرتی ہوتی اور جان نثار ڈیڈی
اسے لفظی تسلی دے دیا کرتے۔ اس کے بعد تصویر کشی کا سلسلہ ختم ہو جاتا۔ اب تو یا بس
کے کسی شلف سے یا پھر اپنی میز کے ڈراور سے وہ کوئی میگزین ہی کھینچ لیتی اور اس کی
ورق گردانی شروع کر دیتی اور اس طرح شام سے لے کر ۸ بجے شب کا عرصہ گذر
جاتا۔ اور ہم نے کبھی ان اوقات میں اسے درس کی کتاب پڑھتے نہیں دیکھا تھا۔ اور
یہاں پھر وہی بات یعنی ہم خواہ مخواہ سوچنے پر مجبور ہوتے تھے کہ یہ لڑکی پڑھتی لکھتی ہے
سار ڈھے بائیس لہذا ہو گی کچھ یوں ہی سی ایک تعلیم یافتہ۔ لیکن وہ کالج بلا ناغہ جاتی تھی
اور کلاس کی حاضری بدستور دیا کرتی تھی پھر تو شک ہوتا تھا کہ وہ پچھلی بنچ پر بیٹھتی

ہو گی اور جب تک کلاس میں پروفیسروں نے جھک مارا ان کا منہ چڑاتی رہی اور
گھنٹہ بجا اور لیکچر اور کتابیں بند ہوئیں اور آگے پیچھے گون درست کرتی ہوئی اور بالوں
سے ہیئر پن اٹکاتی ہوئی کالج کمپاؤنڈ سے کسی روڈ پر پھر کسی اسٹریٹ پر پھر کسی لین
سے گذر کر مکان پر پہونچ گئی۔ اور پھر مکان سے کسی پارک میں یا پھر کسی سینما ہال میں
یا پھر سر شام اپنے ڈرائنگ ٹیبل پر اور پھر وہی سرمستی کی کیفیت اور وہی نقش و نگار
میں کھو جانا۔ حالانکہ سڑک پر کے کسی آدمی کے لئے یہ جاننے کی کوئی ضرورت نہیں تھی کہ
کوئی لڑکی ہوم ٹاسک کرتی ہے یا نہیں، یا پھر اس نے کلاس میں کون کون سے کارہائے
نمایاں انجام دیئے۔ تاہم بیاں جیسے یہ سب کچھ جاننا اپنے لئے ضروری تھا لہٰذا ایک
تحقیق اور تجسس بیاں من جانب قدرت دامن گیر تھی اور جو پوچھے کہ آپ یہ سب کچھ
جان کر کیا لیں گے تو ظاہر ہے جواب نہیں رکھتے۔ اور مشکل یہ پیش آئی تھی کہ ہم جو اسکے
بارے میں اس قدر ذہنی تکلف میں مبتلا تھے نہ جانے اسے اس کا علم کس طرح ہو گیا
تھا کہ وہ ہمیں بڑی مشکوک نگاہوں سے دیکھتی تھی اور کبھی کبھی اس کی تیرتی ہوئی
نگاہیں جو ہمارے چہرے پر مرکوز ہو جاتیں تو وہ نگاہیں ہمیں ملامت کرتی نظر آتیں اور
اپنی عبارتوں میں کہتی ہوتیں "تم ہمارا اسطرح مطالعہ نہ کیا کرو ورنہ اچھا نہیں ہوگا"
اب خیال کے طور پر ہم نے اسے کبھی گھر کا کوئی کام کرتے نہیں دیکھا تھا۔ اور جو کبھی
دیکھا تھا تو آئینے کے سامنے۔ اس کے سنہرے بالوں کے سنوارنے میں یا تو روزانہ ایک
کنگھی ٹوٹتی تھی یا پھر جسم کے آگے پیچھے کا جائزہ لینے میں آئینے کی سطح پر بال سا آجاتا تھا۔
اور خیر ہوئی تھی کہ وہ لپ اسٹک کا استعمال ہی نہیں کرتی تھی ورنہ چاک دامن سے لیکر
چاک جگر کے منظر بھی پیش نظر ہوتے۔ اور لپ اسٹک کے استعمال کی اسے ضرورت

ہی کیا تھی جبکہ بدقدرت نے بڑی فیاضی کے ساتھ اس کے ہونٹوں کو کسی کے خون جگر
کی ساری رنگینیاں بخشی دی تھیں - اور وہ اسطرح کتنی ہی نیک اور معصوم کیوں نہ ہو
یہاں اپنی نظر میں جرم خون کا مرتکب ہی نظر آتی تھی - اور وہ چلتی پھرتی نوبہار بہار دل
کو شرمندہ کرنے والی گل و گلزار کی نکہت اڑانے والی، اسنو کریم اور پاوڈر وغیرہ کا
استعمال کچھ اس افراط سے کرتی کہ معلوم ہوتا اس کے قدم قدم پہ پیرس کی سینٹ کی
شیشیاں ٹوٹ رہی ہیں - اور یہاں قدرتی طور پہ پھر وہی دلچسپی پیدا ہونے لگتی اور عالم
تخیل میں نظر آجاتا مشاطہ خس بدنداں ہے - آئینہ اپنا سامنہ لے کر رہ گیا ہے - اور
عطار دکان چھوڑ کر بھاگ رہا ہے اور یہاں خود جو ایک مردم گزیدہ کی طرح بھاگ
رہے ہیں تو پتہ نہیں کس سمت جا رہے ہیں -

ہر چند چوٹ پر چوٹ کھا رہے تھے لیکن درحقیقت یہاں بھاگ نہیں رہے تھے
اور بھاگ ہی رہے تھے تو سچی بات یہ ہے کہ کسی سحر زدہ کی طرح عین خطرے ہی کی
جانب بھاگ رہے تھے - حالانکہ اس کی طرف سے چوٹ بڑی سدھی ہوئی کھائی تھی لیکن
لبوں پر ہنوز الاماں اور الحذر کے ترانے بلند نہیں ہوئے تھے - دل میں سوچتے اگر یہ
سماعت کی چوٹ ہوتی تو اس قدر سنگین نہیں ہوتی اور یہ تھی براہ راست بصارت کی چوٹ
لہذا اس سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں - پھر تو یہاں ساری پامردی اور عقل کی تمام تر
بلند پروازی یکے بعد دیگرے جواب دے گئی تھی - اور یہ چوٹ کچھ ایسی غضب کی ہوتی
ہے کہ یہاں بڑے بڑے ارسطو اور افلاطون کی فراست جھک مارنے لگتی ہے -

پھر رفتہ رفتہ واقعات نے پلٹا کھانا شروع کیا تھا اور اب وہ ہم سے بات کرنے
کے لئے بیتاب نظر آتی تھی اور کچھ نہیں تو رسمی طور پہ کچھ بات ہی کر لیا کرتی - اور یہ سلسلہ

کچھ ایسا مستقل ہوتا گیا تھا کہ ایک عرصے کے بعد وہی بات صادق آئی تھی کہ گنوار
پیاسے کے پیچھے بھاگا جا رہا ہے۔ اور چونکہ اس لڑکی کی ساری حاشیہ آرائیاں اور ملمع
سازیاں کچھ بے سبب نہیں تھیں پھر تو ایک دن ساری قلعی کھل گئی تھی اور آخرش
وہی بات پیش آگئی تھی جس کا عین خطرہ تھا۔ حالانکہ ساری بات ظاہر تھی لیکن یہاں کچھ
ایسے لو دیئے سے تھے اور کچھ اس قسم کے پہونچے ہوئے عقلمند واقع ہوئے تھے کہ گویا دن
کو پوچھ رہے تھے کہ اس وقت دن ہے کہ نہیں۔ مثلاً اس سے ہم نے پوچھ لیا تھا۔

"مس یاسمین۔ یوں تو ہم کچھ ہی نہیں۔ لیکن انداز غالب ہے کہ آپ مجھ سے
اگر نفرت کرتی ہیں تو محبت بھی ضرور کرتی ہونگی۔ حالانکہ آپ کی جانب
سے ایک "ہاں" یا "نا" ہی کافی ہے"

پہلے تو وہ کسی قدر سمٹی سمٹائی تھی لیکن فوراً ہی بات کی تہ تک پہونچ گئی تھی۔
پھر تو بڑی وضع دارانہ انداز میں بات کرنے لگی تھی

"حالانکہ ہمارے نہ کہے گئے "ہاں" یا "نا" کو سمجھنے کی صلاحیت آپ
میں خود ہونی چاہیئے تھی۔ اور آپ کو سوال نہیں کرنا چاہیئے۔ لیکن یہ کیا
حالانکہ......؟"۔ اس نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا تھا اور
پھر تو بڑے مزے کی ہنسی ہنسنے لگی تھی

ہر چند اس کی ہنسی کا مفہوم ظاہر تھا لیکن یہاں جیسے اپنی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا
تھا اور یہاں جیسے ایک اشتیاق ہی بڑھایا گیا تھا

"پھر تو آپ کہہ دیجئے کہ آپ مجھ سے نفرت ہی کرتی ہیں پھر تو ایک دفعہ ہم
بھی اپنی قسمت کے قائل ہو جائیں گے"۔ ہم نے بھی کسی تو گرفتار محبت

کی طرح اچھی خاصی خفت کا مظاہرہ کیا تھا۔

"یہ کس طرح کہہ دوں حالانکہ ہم نے آپ سے کبھی نفرت نہیں کی" وہ بدستور ہنستی جا رہی تھی۔

"پھر تو یہی کہہ دیجئے آپ خاکسار سے محبت ہی کرتی ہیں" اور ہم بھی بدستور خفت کا مظاہرہ کرتے جا رہے تھے۔

"حالانکہ میں نے ابتک یہ بات بھی نہیں کہی" وہ اب اور زیادہ ہنس رہی تھی۔

اور یہاں ہم اپنی خفت کی انتہا کو پہونچ گئے تھے اور اسے سخت ملامت کی تھی

"جب تم نفرت بھی نہیں کرتی اور محبت بھی نہیں کرتی۔ پھر تم کیا کرتی ہو۔ اپنا سر؟"

"دیکھئے جناب یہ سوال آپ کو کبھی کسی لڑکی سے نہیں کرنا چاہیئے اس لئے کہ اس میں شک کا ایک شائبہ پایا جاتا ہے"

"تمہیں شک کا شائبہ ہو یا نہ ہو ہمیں پورا شک ہے کہ تم اپنی جانب سے محبت کرتی ہو"

وہ تو پہلے جھجکی تھی کہ یہ بات کیونکر کہہ دے لیکن کسی قدر رواضح ہو گئی تھی

"حالانکہ شک جب اپنی تکمیل کو پہونچ جاتا ہے یقین میں مبدل ہو جاتا ہے۔ یہی اپنا بھی عقیدہ ہے" اس نے قطع کلام کیا تھا۔

آپ کسی لڑکی کو لاکھ سمجھائیے لاکھ نصیحت کیجئے لیکن کیا مجال کہ وہ زبان

سے براہ راست اقرار کرلے کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ چنانچہ اتنی سی بات کہہ کر وہ ایک دم سے رخصت ہوگئی تھی اور دور دور تک نظر نہیں آئی تھی اور اسکے بعد سے تو بال بال موتی پرونے کا سارا سلسلہ ایک عرصہ کے لئے کچھ اس طرح منقطع کردیا گیا تھا کہ گویا ایک نئی بات ظہور میں آگئی تھی۔

۳۔

مُرجھایا ہوا حُسن:-

مغرب کی ناکتخدا یا بن بیاہی تعلیم یافتہ لڑکیاں کچھ اس قسم کی لڑکیاں ہوتی ہیں جو بلا شبہ ماں باپ کی محبت کی خمیر سے پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن وہ محبت سے نفرت کرتی ہیں اور زندگی مجرد بسر کر لیتی ہیں۔ مجرد اس لحاظ سے کہ وہ اپنی زندگی کی آخری بیسیوں تک یا پھر تیسوں کی اوائل تک ہی شادی سے نفرت کرتی ہیں۔ محبت سے چڑتی ہیں، مردوں کو ہیچ سمجھتی ہیں اور ان کو حقارت کی نظر سے دیکھتی ہیں۔ زندگی کے ہر شعبے میں اور ہر میدان میں اور ہر دوڑ میں مردوں سے کشیدہ و کبیدہ اور چڑھی چڑھی سی نظر آتی ہیں اور اس قدر نازک مزاج اور نازک دماغ ہوتی ہیں کہ مردوں کا سایہ بھی ان کی طبع حزیں پر گراں گزرتا ہے۔ اور قدم قدم پر مردوں سے دامن جھٹکتی نظر آتی ہیں۔ اور یہ باتیں پھر ایک عرصے تک نوجوانوں کیلئے اس قدر بجلی گرانے والی اور آگ لگانے والی ہوتی ہیں کہ وہ بے تحاشا ان کا پیچھا کرتے ہیں بھاگتی ہوئی تتریوں کے پیچھے وہ ہلاک ہوتے ہیں اور دو دو چار چار تھک تھک کر کچھ ادھر گرے کچھ ادھر گرے اور منزل کا پتہ نہیں پاتے ہیں۔ منزل کی انہیں جتنی ہی جستجو ہوتی ہے منزل ان سے اتنی ہی بھاگتی نظر آتی ہے۔ کچھ اس قسم کی غزال رعنا لڑکیوں کے پیچھے صیاد قسم کے

کچھ نوجوانوں کا تو یہ محبوب مشغلہ ہوتا ہے کہ بڑی سنگینی اور سرد مہری سے پیچھا کئے
جا رہے ہیں کہ جانے نہ پائیں لیکن ان کی نگاہیں صاف دھوکہ دے جاتی ہیں۔ ہونٹ
اور لوٹ کی ایک سے ایک نئی تراش لیکر، وضع قطع اور چال ڈھال کی ایک سے ایک
اسٹائل اپنا کر اور کاٹ چھانٹ اور میک اپ کے سارے کیل کانٹوں سے مسلح ہو کر
ان کا پیچھا کرتے ہیں۔ لیکن وہ غزال رعنا ہاتھ نہیں آتی۔ ان کو وہ کس تمنا سے دل
میں بساتے ہیں اور ان کو کیسی کیسی نظروں سے دیکھتے ہیں اور قدم قدم پر ان کے
قدموں پر اپنی ٹوپیاں رکھتے ہیں لیکن وہ چلتی پھرتی باغ و بہار مستقل چوکڑیاں بھرتی
نظر آتی ہیں۔ لیکن آخر کب تک؟ ایک وقت آخر آہی جاتا ہے کہ اب گنگا الٹی بہنے
لگتی ہے۔ کہاں وہ چوکڑیاں بھرنا اور کہاں وہ دامن جھٹکنا، کہاں وہ بجلی گرانا اور
کہاں وہ آگ لگانا، اور کہاں وہ کاٹ کھانا اور پانی تک نہ دینا۔ کہاں وہ
بسمل بنانا اور بسمل کے تڑپنے اور پھڑکنے کا تماشا دیکھنا، کہاں وہ بالائے بام ہونا
اور زیرِ دام نہ دیکھنا اور کہاں عشق کا مرض لگانا اور دردِ دل کے نسخے نہ باندھنا
اور پھر آج کہاں ان کی بیٹیوں کی ادا اخر کی جوانی جواب لبِ بام سے زینوں پر اتر
آئی ہے لیکن ان کے حریم ناز میں جھانکنے والا کوئی نہیں۔ وہ پرانے طائر جو کبھی
زیر دام تھے اب اڑ چکے ہیں، وہ پرانے جان نثار جو قدم قدم جان چھڑکتے تھے
اب رخصت ہو چکے ہیں۔ اب تو لاکھ چراغِ رخِ زیبا لے کر ڈھونڈیئے لیکن عشاق تو
ہمیشہ کے لئے وعدہ فردا لے کر جا چکے ہیں۔

ایک بارونق شہر میں اسطرح کی ایک ناکتخدا لڑکی کے لئے سانس لینا بھی
مشکل ہو جاتا ہے۔ تنہائی اور زندگی کی بیرنگی پھر اخلاق کا دباؤ اور شادی کا

تقاضا اور پھر معاشی الجھنیں یہ ساری چیزیں مل ملا کر اسکی زندگی کو کچھ اسطرح بے سری بنا دیتا ہیں کہ سخت مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ حالانکہ ان مسائل میں کچھ مسائل تو ایسے ہیں جو زمانے کی ابتدا ہی سے اسے درپیش ہیں۔ لیکن فی زمانناً انکی نوعیت جداگانہ ہوتی ہے۔ چنانچہ ایسی لڑکیوں کو سب سے پہلے سوسائٹی سے نپٹنا پڑتا ہے جو اس سے قدم قدم پر الجھتی ہے۔ سوسائٹی اسے فکر معاش دیکر اس سے مردوں کی طرح کام لیتی ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں اس سے مردوں کی طرح برتاؤ کرتی ہے۔ اور حد یہ ہے کہ اسے مردوں کی طرح رہنے سہنے اور مردوں کی طرح سوچنے بچارنے پر مجبور کرتی ہے لیکن اسکی غلطیوں اور لغزشوں کی سزا اسے عورت ہی بنا کر دیتی ہے۔

لیکن آج سے بیس سال پہلے اسے اتنے سارے مشکلات درپیش نہیں تھے۔ اس وقت وہ اپنی ذات سے بھی مستغنی ہو کر گذر بسر کر سکتی تھی۔ وہ تو اپنی بھانجیوں بھتیجیوں اور چھوٹے چھوٹے بہن بھائیوں کی اتالیقی کر کے یا پھر اپنی بہنوں اور سہیلیوں کی باغ و بہار زندگی کے ارد گرد چکر لگا کر اپنی زندگی کے دن کاٹ سکتی تھی۔ یا کم سے کم اگر وہ باندھ چھاند کر "مانجھے" بٹھا ہی دی گئی اور اللہ اللہ کر کے اس کی شادی ہو گئی تو حجلۂ عروسی سے بھاگ کر یا پھر ماہ عروسی سے چڑھ چڑھ کر بھی وہ بسر اوقات کر لیتی تھی اور یہ ایک بات بھی ہوتی تھی کیونکہ آخر شش اس کے والدین اس کی تاعمر کفالت نہیں کر سکتے تھے در آنحالیکہ انہیں ایک دن مرنا ہی تھا۔

آج آپ پیرس اور لندن وغیرہ میں دیکھ لیجئے حسین حسین لڑکیاں تھیٹروں، اسٹوڈیوں ٹیلی ویژن کی ایجنسیوں اور کتنے دیگر نظر فریب اداروں کے گرد چکر کاٹتی نظر آتی ہیں۔ حالانکہ وہ تعلیم یافتہ ہیں۔ ان کے پاس کالجوں اور یونیورسٹیوں کی ڈگریاں ہیں۔ ان کے پاس ذہانت اور فطانت ہے عقل کی روشنی ہے اور پرداز تخیل

ہے اور بائیں پرواز بھی میں لیکن وہ مجروح اور پرشکستہ ہیں۔ لیکن یہ تو وہی تیتلیاں ہیں
جنہیں اپنے گھروں میں خیمہ زن ہو کر یہ انتظار نہیں تھا کہ ایک نہ ایک دن حسن و عشق
کا کوئی کھویا عشق کے جوار بھاٹے کرتا ہوا انکا کھوج ضرور نکال لے گا۔ پھر خدا
کے دیئے ان شہروں میں ان کی حالت کچھ اس طرح کی ہوتی ہے کہ بیسیوں کی آخری
منزل میں مجاذبِ نظر تو بلا کی ہوتی ہیں، لیکن شادی کے لحاظ سے بالکل ردی اور
نکمی ہوتی ہیں۔ پھر تو ان کی سب سے بڑی خطا یہ ہوئی کہ جب انہوں نے کالجوں اور
یونیورسٹیوں کی ڈگریاں حاصل کی تھیں تو ساتھ ہی ساتھ انہیں ایک شوہر حاصل کر لینا
چاہیئے تھا۔ اور جبکہ انہوں نے ایسا نہیں کیا اور بدقت تمام انہیں کوئی نوکری
مل گئی تو حالت ان کی کم و بیش ایک پیش خدمت کی سی ہوتی ہے، پھر تو وہ کچھ ایسے
ایسے حسین حسین برسرِ روزگار جوانوں سے رسم و راہ پیدا کرنے پر مجبور ہوتی ہے جو
حسنِ کلام رکھتے ہیں ذاتی کشش رکھتے ہیں نگاہوں میں جلنی بیقراری رکھتے ہیں رہنے
سہنے کے لئے خوبصورت فلیٹ رکھتے ہیں اور دیکھنے کے لئے وہ سبھی کچھ رکھتے ہیں لیکن
دیکھتے دیکھتے ایک دن ان حسین لڑکیوں کو پتہ چل جاتا ہے کہ زندگی ان کی باغ و بہار
ہی سہی لیکن نیت ان کی نیک نہیں پھر تو ان کے جگر سے آہ کا دھواں اٹھتا ہے
کہ اے کاش ہمیں سر پھوڑنے کے لئے کسی حرم کی دیواریں ہی نصیب ہوتیں — اور
پھر وہ تیس سے لے کر چالیس سال کا نوجوان ایک ایسی سر پھری لڑکی کی زلف گرہ
گیر کا اسیر کیوں بن جائے اور اس کے حریم ناز کا قیدی کیوں بن جائے جبکہ وہ بر وقت
ایسی درجنوں ماہ سیماؤں کی چوٹوں کو ایڑیوں کے نیچے دبا سکتا ہے۔ اور اسے ایک سے
شادی کی ضرورت ہی کیوں ہو جبکہ وہ بر وقت درجنوں نازنینوں سے کچھ ایسی شادی

کے مراسم رکھ سکتا ہے جو کبھی کبھی پاپائے کلیسا کے دقیانوسی خطبوں کے مرہونِ منت نہیں بن سکتے ــــــ اور وہ دل تھام کر بھاگتی نظر آتی ہے۔ اور اس عالمِ فرار میں قسمت کی گردش اسے ایک ایسے نوجوان سے ٹکرا دیتی ہے جسے واقعی لپ اسٹک آلودہ لبوں سے اور کیوٹکس سے چپکے ہوئے ناخنوں سے صحیح محبت ہوتی ہے لیکن پھر ایک نئی مصیبت آن کھڑی ہوتی ہے کہ وہ نوجوان کچھ واسکوڈے اگاما قسم کا نوجوان ہوتا ہے جس کا کام محض انکشاف ہی انکشاف ہوتا ہے۔ اس کے پاکٹ میں ایک چارٹ کے قسم کی چیز ہوتی ہے اور وہ چارٹ دراصل بازارِ محبت میں سود بازی کا ایک سٹہ ہوتا ہے۔ پھر تو وہ کسی ریسٹورنٹ میں اس نازنین کے ہمراہ بیٹھتا ہے اور اس کو طرح طرح سے جانچتا ہے اس کا سخت سے سخت امتحان لیتا ہے لیکن کبھی نہیں سوچتا ہے۔

"آخر یہ ایک لڑکی ہی ہے۔ قبولِ صورت بھی ہے اور جاذبِ نظر بھی ہے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں سے اسے صحیح تعلیم بھی ملی ہے۔ اس کا قد بھی صحیح ہے خدوخال بھی درست ہیں اور اوپر سے نیچے تک صحیح پیمائش بھی رکھتی ہے۔ اور پھر سینوں میں امنگوں اور ارمانوں کی ایک دنیا بھی رکھتی ہے اور خاصکر اسکے ساتھ کیسی کیسی تمنائیں وابستہ رکھتی ہے ــ کیوں نہ اس کا ساعدِ سیمیں تھام لیا جائے اور اسے کھینچکر چشمِ خلق سے دور لے جایا جائے۔ اور مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے اور پھڑکنے کا ایک سامان مہیا کر لیا جائے،،

لیکن کہاں وہ ایسا تو نہیں کرتا ہے۔ اور وہ ایسا کرے تو کیوں کرے جبکہ وہ ایک تاجر ہے اور اس کی جیب میں جو ایک کاغذ ہے اسے ــــ پھر تو وہ اس سنگدل کے ارد گرد سے ایک مجروح طائر کی طرح پھڑپھڑاتی ہوئی بھاگتی ہے۔

لیکن وہ کہاں مانتی ہے اسے تو ہر ناکامی میں آئندہ کے لئے ایک کامیابی کی صورت نظر آتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ وہ اپنی تلاش اور جستجو کی آخری منزل میں ایک ایسے مرد کے آگے سامنے آجاتی ہے جس کے آگے پیچھے اخلاق ہی اخلاق ہوتا ہے جس کے آس پاس محبت ہی کی جوت جگتی ہے اور جسکے اردگرد حسن سیرت کی بجلیاں کوندتی ہیں۔ اور جو سراپا اخلاص و کرم ہے اور ہمدردی اور فیاضی کا ایک پیکر مجسم ہے اور کیوں نہ ہو جبکہ وہ بحید تجربہ کار اور بڑا ہی آزمودہ کار سپاہی ہے اور وہ مرد مجاہد تو ابتک جتنی محرکوں ہی میں کام آتا رہا ہے اور اسکے تمغے طرہ پر یا پھر خاموش گواہ کی حیثیت سے اسکی ڈارلنگ والف موجود ہے یا پھر اسکی بیشمار محبوبائیں ادھر کسی اسٹریٹ کے مینشن میں یا ادھر کسی روڈ کے کارنر پر دھری پڑی ہیں۔ اسنے کسی زمانے میں شادی کرلی تھی اور اس شادی کی یادگار اسکے پاس ایک پرانی ڈارلنگ ہے جو اس کی کفالت کرتی ہے اور جو ابتک یا تو بہت سارے بچے دے چکی ہے اور یا بالکل ناکاری اور نکمی بن چکی ہے یا وہ دارلنگ کچھ زیادہ نازک مزاج اور نازک اندام ہے جسے باربرداری کے کام ہی سے نفرت ہے اور اسنے اپنے ہی شوہر کو عشق بازی کی زادراہ اور لائسنس عطا کرتے ہوئے عشق کا جنگل دکھا دیا ہے اور اسکے کان اینٹھ دیئے ہیں کہ سیر و شکار جو کچھ بھی ہو تم شوق سے کرتے رہو لیکن خبردار جو کوئی شکار لکڑی سے ٹکرا کر دلیز پر لے آئے یا شکار کرتے ہوئے خود شکار ہوئے اور پھر وہ بھی بیسویں صدی کا فرمانبردار اور فدوی قسم کا شوہر ہے۔ اپنے بتائے ہوئے جنگل میں ڈیرا ڈال دیا۔ پھر تو اسنے ایسے ایسے معصوم پرندوں کو مجروح کیا کہ وہ پھڑپھڑانے بھی نہیں پائے۔ اور دوران شکار میں تو اسنے اسی ناکتخدا تعلیم یافتہ لڑکی کو گھائل کر دیا۔ اور وہ لڑکی گھائل کیوں نہ ہو جبکہ اسکے لئے اس ہی قسم کے عاشق زار میں بڑے بڑے تازہ دم الھڑ جوانوں سے کہیں زیادہ کشش تھی اسلئے کہ وہ عشق بازی کے زیادہ داؤ پیچ جانتا تھا اور وہ بہتر کیل کانٹوں سے مسلح تھا۔ اس کی گرمجوشی

اور سینہ شگافی اس درجے کی تاثیر رکھتی تھی کہ ممکن نہیں کہ کوئی بہت زیادہ تعلیم یافتہ دوشیزہ
اس کے ارد گرد سے بغیر چوٹ کھائے نکل جائے۔ وہ اسکے گرد گردش کرنے لگی تھی۔ لیکن حلقہ بگوش
ہونیکے ایک عرصہ بعد اس کا دل ڈوبنے لگا اور ایک دن اسے مکمل اطلاع مل گئی کہ یہ اپنی ڈارلنگ
کا بھی "اسے اپنے سوا دنیا کی ساری نعمتیں عطا کر سکتا ہے"۔ اور اسکا دل پاش پاش ہو گیا وہ اس
سے دامن چھڑا کر بے تحاشا بھاگ نکلی۔ اب وہ مکمل طور پر مجروح ہے اسکا سینہ شگاف ہے اور
اور جگر چاک چاک ہے اور اسکی دنیا برباد ہے۔ اور اب اسے کسی انسان نما حیوان کی مزید ضرورت نہیں!
چنانچہ اسی قسم کی ایک تعلیم یافتہ، بد قسمت اور سینہ شگاف ناکتخدا لڑکی میرے دفتر کی
زینت بنگئی تھی۔ اس نیک سیرت کا نام مس روزی تھا وہ کسی زمانہ میں گلاب کا پھول ہی
تھی لیکن اب نہیں کیونکہ اب اسکی جوانی کی یادگار ایک مرجھایا ہوا حسن باقی رہ گیا تھا جو حد
درجہ سوگوار تھا۔ اور جیسا کہ ذکر آئیگا خاکسار اس سے رنگینی لوٹنے کے پھیر میں تھا حالانکہ
یہ سراسر افترا اور بہتان تھا اور یہ ساری بات ایک صاحبزادی کی کارگاہِ ذہن کی مصنوعہ تھی
باوجود اسکے یہاں جمعیتِ خاطر تھی کیونکہ غم عشق نہیں تھا۔ حالانکہ وہ لڑکی ہی تھی کیونکہ وہ
ناکتخدا تھی اور اسکی عمر خواہ کچھ ہی ہو ان دیئے گئے احوال میں اسے لڑکی ہی کہا جا سکتا تھا لیکن
دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک پیئے عشق و محبت کے نام سے اسکے ہاتھ کانوں تک جاتے تھے
وہ اپنے دل پر پتھر رکھ سکتی تھی لیکن عشق و محبت کے ترانے اسکے لب پر نہیں آسکتے تھے۔
دراصل اس خانہ خراب عشق نے اسے اتنی ہی ٹھوکریں لگائی تھیں کہ وہ اب بالکل راہِ صواب پر
آگئی تھی۔ اب اسکی زندگی کا واحد مشغلہ تھا دفتر میں کام کرنا اور زندگی کے دن گزارنا۔ اسکو
کبھی کسی مرد سے آنکھ ملاتے نہیں دیکھا گیا تھا۔ اور نہ اسے کسی سے بات کرتے ہی دیکھا گیا تھا۔
حالانکہ وہ میرے ساتھ بحیثیت معاون کے دن کے ایک مقررہ اوقات تک کام کرتی تھی لیکن

مجھ سے چھوٹے منہ اسے بات کرنا بھی گوارا نہیں تھا۔ دفتر پر ہوتی تو فائلوں میں مستغرق ہوتی اور فائلوں سے فارغ ہوتی تو گھر پر ہوتی۔ بس اسکی زندگی کا یہی معمول رہ گیا تھا۔ دو چار دن تو ہم نہیں سمجھ سکے تھے کہ آخر یہ قصہ کیا ہے لیکن جب یہ سلسلہ مستقل نظر آیا تو ہمیں کچھ شک ہونے لگا اور شک کیا ہوتا ہم سوچنے پر مجبور ہوئے تھے کہ شاید ہم سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہے جس کا ہمیں علم نہیں لیکن اسے اسکا علم ہے لہٰذا ہم سے وہ متنفر ہے۔ مقررہ وقت پر دفتر پہونچ جاتا اور دفتر کے بند ہونے تک مسلسل کام میں مصروف رہنا۔ کاغذات کو نہایت سلیقے کے ساتھ ترتیب وار فائیلوں میں رکھنا اور فائیلوں کو صحیح ترتیب کے ساتھ شلفوں کے حوالے کرنا کبھی کچھ ٹائپ کرنا یا کچھ لیبل بنانا اور فائلوں پر چسپاں کر دینا گویا یہی کچھ کرنا لیکن بات نہ کرنا اور پھر گھر چلے جانا۔ حالانکہ یہاں اس سے ہمیں اور ہم سے اسے بات کرنیکی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ یہاں ضرورت صرف یہ دیکھنے کی تھی کہ دفتر کا کام ٹھیک چل رہا ہے یا نہیں اور وہ حسب معمول سارے کام بڑے حسن و خوبی کیساتھ انجام دے رہی تھی۔ اور کسی غلطی کی کوئی گنجائش نہیں تھی لیکن یہاں خواہ مخواہ اسکا رویہ گراں گذر رہا تھا اور میرے لئے ایک ذہنی خلفشار کا باعث بن رہا تھا۔ لیکن یہاں ہمت بھی نہیں پڑتی تھی کہ ہم اس ناکتخدا سے اتنا ہی پوچھ لیتے کہ تم گھر سے ناراض ہو تو ہو لیکن دفتر نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ بارہا طے کیا کہ اس سے یہی ایک بات پوچھ لیں لیکن تو یہ ہے ہمت جواب دے گئی تھی۔

اور ایک دن تو کمال ہی کر دیا تھا۔ آپ دفتر میں تشریف لائی ہی تھیں کہ ہماری زبان سے الحذر کا نعرہ بلند ہوا تھا اور سارے کام رک گئے تھے۔

"آج آپ فائل، شلف، ٹائپ رائٹر اور ڈیسک ان چار چیزوں کو ہاتھ نہیں لگائیں گی!" ہم نے اسے متنبہ کر دیا تھا۔

"درست۔ پھر تو ہم گھر چلے"، وہ جانے کے لئے پلٹ گئی تھی۔

"آپ گھر بھی نہیں جا سکیں گی"، ہمنے دوسری روک لگائی تھی لیکن وہ گھر جانے لگی تھی۔

"آپ نے سنا نہیں؟"

"جی"، "میں سن رہی ہوں"، وہ رک گئی تھی "لیکن آپ جلدی جلدی کہئے جو کچھ کہنا چاہتے ہیں"

"میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم انسان ہو یا کوئی مشین؟" ہم نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔ اور وہ پلٹ گئی تھی اور ہمارے عین مقابل آن کھڑی ہوئی تھی۔

"جی نہیں۔ میں انسان نہیں۔ میں ایک مشین ہوں اور مشین اس لحاظ سے کہ میں دفتر کی ایک کلرک ہوں اور پھر ان سارے دفتروں میں جتنے بھی کلرک ہیں وہ انسان خواہ ہوں یا نہ ہوں لیکن مشین ضرور ہیں!" اسنے ایکطرف سے سارے دفتروں پر انگلی گھما دی تھی۔

اور ہم نے دیکھا تھا وہ بات کر سکتی تھی اسلئے کہ اسے بات کرنا آتی تھی۔ پھر ہم اپنے کام میں اسطرح مصروف ہو گئے تھے کہ گویا ہم بھی مشین کے ایک پرزہ تھے۔ اور وہ بھی اسیطرح اپنے کام میں مصروف ہو گئی تھی اور اسدن اس سے صرف اسی قدر بات ہو سکی تھی۔ اور دو دن تک ہم اسی طرح کام کرتے رہے تھے۔ لیکن ہماری الجھنیں بڑھتی ہی گئی تھیں۔ تیسرے دن ہم نے پھر اس پر ایک دوسری قید لگا دی تھی۔

"آپ لنچ کے وقت آج لنچ نہیں کھائیں گی"

"کیوں خیریت تو ہے؟"

"اس لئے کہ آپ آج لنچ ہمارے ساتھ کھائیں گی"

اور اسنے بدرجہ مجبوری ہمارے ساتھ لنچ تناول کیا تھا۔ اور لنچ کے دوران ہمارے اور اسکے درمیان صرف دو چار باتیں ہوئی تھیں۔ اور پھر وہی بات یعنی وہی خاموشی وہی انہماک اور بدستور سابق فائیلوں سے سرگوشی لیکن آپس کی بات ندارد۔ ہمیں اب غصہ آنے لگا تھا اور پھر اسکے اس حال پر رحم بھی آنے لگا تھا۔

ایک دن دفتر بند ہونے کے وقت اسپر ہم نے ایک تیسری قید لگا دی تھی۔

"آج آپ گھر نہیں جائیں گی"

"یہ کیوں ؟"

"اسلئے کہ آج آپ ہمارے ساتھ سپر (supper) کھائیں گی اور پھر گھر نہیں جائیں گی"

"اور میں شاید رات آپ کے ساتھ رہونگی اسلئے کہ آپ انچارج ہیں ؟"

"جی نہیں۔ آپ اس کمرے میں رہیں گی بالکل تنہا" ہم نے کمرہ بتا دیا تھا اور کہدیا تھا "میں انچارج وچارج نہیں"

اور ہم نے ایک ساتھ سپر کھایا تھا۔ اور سپر ختم کرکے ایک دوسرے کے مقابل کرسی پر بیٹھے تھے اور میز ہمارے درمیان تھی۔ ہم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

"مس روزی تمہیں روح القدس کا واسطہ۔ تم آج مجھے بتا دو کہ تم سدا غمگین کیوں رہتی ہو۔ کیا مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہوئی ہے" "تمہیں کیا تکلیف ہے" ہم نے اس عاجزی کی تھی۔

"میری تکلیف آپ سنکر کیا کریں گے" اس کی آواز گلوگیر ہوگئی تھی۔

"ادھر دیکھو ۔ روزی ۔ تمہارے اور میرے درمیان فطرت کا ایک حقیقی رشتہ موجود ہے ۔ اور اس انسانی برادری میں میں تمہارا ایک بھائی ہوں اور تم اپنے بھائی کو اپنی تکلیف بے جھجک بتا دو شاید وہ تمہاری کچھ مدد کر سکے "

اپنی بھی حالت غیر ہو گئی تھی ۔

اور وہ بھائی کہہ کر جو اپنی کرسی سے اٹھی تو ہمارے گلے سے آن لگی تھی اور اسقدر روئی تھی کہ اپنی نگاہیں اشک ریز ہو گئی تھیں ۔ اس نے اشک و آہ میں ڈوبی ہوئی اپنی زندگی کی ایک ایسی دردناک داستان سنائی تھی کہ یہاں اپنے صبر و سکون کا پیمانہ چھلک گیا تھا اور وہ داستان ہو بہو وہی تھی جو ایک ناکتخدا لڑکی کی تھی ۔ لیکن اس کے اس دکھڑے میں سوسائٹی کا شکوہ تھا ۔ اور یہ میرے لئے بار گوش تھا کیونکہ سوسائٹی ایک گدھا ہے اور ایک گدھے کا شکوہ صرف ایک ناقص انسان ہی کر سکتا ہے ۔ ہم نے اسے تسلی دی تھی اور طرح طرح سے اس کی دل جوئی کی تھی اور اسے سمجھا دیا تھا کہ اسے ضرورت تھی حوصلہ اور خلوص کے ساتھ زندہ رہنے کی اور اسے بتلا دیا تھا بے شک تم مردوں کے چہرے پر لعنت بھیجو لیکن ہمیں نہ بھولو اور ادھر دیکھو یہاں جو تمہارا یہ بھائی ہے تمہارا حقیقی بھائی ہے ۔ تمہیں تمنا تھی کسی مرد کی حقیقی محبت کی اور وہ محبت تمہیں خواہ تمہاری غلطی سے یا کسی کی غلطی سے ، کوئی کم ظرف مرد نہیں دے سکا تمہیں تمنا تھی کسی مرد کے سایۂ الفت کی لیکن تم اس سے محروم رہی ، لیکن تم یاد رکھو یہ تمہارا بھائی اس بھائی بہن کے ناطے تمہیں اپنے سایۂ عاطفت میں لے چکا ہے تم اس بھائی سے پیار کر سکتی ہو محبت کر سکتی ہو اور وہ ایک ہنسی جو تمہارے لبوں سے مدت ہوئی رخصت ہو چکی ہے اسے اس بھائی پر نچھاور کر سکتی ہو ۔ روزی ۔ ادھر دیکھو ۔ میں تمہارا بھائی ہوں نا ۔

مسکراؤ، مسکراؤ ـــــ اور اس کے لبوں پر ایک ایسی ہنسی نمودار ہوئی تھی کہ بھائی کا دل تڑپ تڑپ گیا تھا۔

اور یہ تمام تر واقعہ تھا یونان کا جہاں ہم ہٹلر اور انگریز کے عدم تعاون سے یا پھر نادانستہ تعاون ہی سے پہونچا دیئے گئے تھے۔ معافی چاہتا ہوں کہ اس سلسلے میں اگر ہٹلر کی اس جنگ کا ذکر نہ کیا گیا جس میں ہم الجھا دیئے گئے تھے تو اپنے مضمون کے ساتھ یقیناً انصاف نہیں ہوگا۔ آپ جانیئے ہٹلر نے ہمیں پہلے اس جنگ میں الجھایا تھا اور پھر انے نادانستہ طور پر ہمیں اس مصیبت کے پھندے میں الجھایا تھا۔ پھر تو ضروری ہے کہ اس جنگ کا ذکر کیا جائے اور یہ جائزہ لیا جائے کہ وہ کمبخت جنگ جو ہٹلر نے شروع کی تھی وہ لڑائی کس طرح گئی تھی؟ اور لڑنے والے فریق جو یہ جنگ لڑتے تھے تو کیا وہ سچ مچ آپس میں لڑتے تھے یا کچھ ایسی لڑائی لڑتے تھے جو آگے چلکر انہیں خود سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ کیا لڑتے تھے اور کس سے لڑتے تھے؟ ـــــ

رُخِ ثانی

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا،،

خطاوار کون؟

اگر گذشتہ عالمی جنگ بمنزلہ ایک درخت کے تھی تو اس کی جڑیں ہیگل اسکول کے مفکرین کے دماغوں میں نظر آتی ہیں۔ ہیگل ایک مفکر یا فلسفی تھا، اس کے فکر و نظر اور فلسفہ کی تخلیق و تربیت تاریخ نے کی تھی، اور وہ خود بھی تاریخ ہی کی پیداوار تھا، اور اسنے عہد آفرینی بھی کی تھی، لیکن تاریخ ایک ارتقا پذیر اور تغیر پسند عمل ہے جو اپنی انقلاب انگیزی کے ساتھ ساتھ فکر و نظر کے نت نئے پہلو پیش کرتی رہتی ہے۔ فلسفہ کی تخلیق میں انسانی کیرکٹر کو بڑا دخل ہے، اور انسان کو اپنے کیرکٹر سے زیادہ دلچسپ دنیا میں کوئی کیرکٹر نہیں وہ اپنی لغزشوں کو بھی ایک معنویت عطا کرنے کے درپے ہوتا ہے، وہ اولاً ایک مجاہد ہے اور ثانیاً ایک فلسفی، اور وہ کسی وقت بھی کچھ طبعی اور نفسی ضروریات کے تحت اپنے سرفروشانہ جذبات کا مظاہرہ کرسکتا ہے، اس ترکہ بربریت

سے جو اسے نسباً حصے میں ملا ہے وہ کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا، اس کا
تمام تر فلسفہ اور اس کی ساری منطق بلا واسطہ اس کی بے محابا آرزو، لگن، امید
خوف اور جھجک کی پیداوار ہیں جو اس کی طبعی اور نفسی زندگی کے بے اختیاری عمل
ہیں ایسا کوئی دماغ نہیں جو تحریک جسمانی اور وجدان حیوانی سے مبرا ہے، ہمارے
وہ پوشیدہ محرکات اور خفیہ آرزوئیں جن کے پٹھوں پر ہم بہ مشکل ہاتھ دھر سکتے
ہیں، ہمارے بیدار خیالات کو حیرت انگیز طریقے پر متاثر کرتے رہتے ہیں۔
وہ بہتیرے خوابیدہ تصورات ہمارے ایام طفلی کے تاثر اندوزی کے دور کی
پیداوار ہیں، اگر بڑے بڑے ثقلقی حضرات اپنی عظمت کی زعم میں خم کھا
بیٹھیں اور بھولتے ہوئے نظر آئیں کہ وہ کبھی خرد اور طفل تھے اور وہ اب اسی
کی ایک ارتقاپذیر صورت میں ہیں تو یہ ان کی اپنی غلطی ہے!

انسانی وحدت ملی ایک تاریخی عمل ہے یہ کوئی مشینی وحدت نہیں در
آنحالیکہ وحدت ملی ایک ارتقاپذیر اور تغیر پسند عمل ہے اور اس کے افراد
کے بدلتے ہوئے رجحانات اور طبعی اور نفسی محرکات کی بنا پر متغیر اور متبدل
ہوتی رہتی ہے، اس وحدت کو آج تک تنہا نہ کوئی فلسفہ، نہ کوئی روایت
نہ کوئی ضابطۂ دینی اور نہ کوئی قواعد روحانی استوار رکھ سکا، یہ اگر اپنے
مقاصد کی بلندی میں اور رفعت پرواز میں ثریا کے ہمدوش ہے تو یہ زندگی
کے نت نئے جرم کی جستجو میں زمین گیر اور زمیں تاز بھی ہے، اس کی جڑیں جغرافیہ
اور ماحول میں زمین دوز ہیں، اور ان سے اس کا چولی اور دامن کا ساتھ ہے،
اس وحدت کو نہ کوئی عالمگیر جنگ نہ کوئی شجاعت نہ کوئی سرفروشی نہ کوئی

جذبہ شہادت نہ کوئی مشہد مقدس نہ کوئی نصرت وکامرانی اور نہ کوئی فتح وظفر استوار اور پائندہ رکھ سکا ہے۔

گذشتہ عالمی جنگ اگرچہ ہٹلر کی ایجاد تھی لیکن اس کی لیبارٹری مغربی طاقتوں کا سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام تھی جہاں یہ پھلی پھولی اور پروان چڑھی تھی، ہٹلر دراصل ہیگل اسکول کے مفکرین کی نظری تھیوری کا دلدادہ تھا اور وہ فرد اور ملت کے اصول میں ایک DETERMINISM کا مرتکب تھا، مثلاً یہ کہنا "ملت کی عظمت ان خدمات سے جو وہ افراد کے حق میں انجام دیتی ہے زیادہ بلند ہے"۔ یا یہ کہنا "فرد کا مفاد ملت کے مفاد پر قربان کر ڈالو"۔ یہ نعرے تو فرد اور ملت کے مابین اس رشتے کی تردید کرتے ہیں جو ایک دوسرے کے باہمی تعاون کی پیداوار ہیں، یہ کہنا خطائے صریح ہے کہ ملت ہی واجب الوجود ہے جو افراد میں ظہور پذیر ہے اور وہ انسے ماوراء ہے، پھر قومیت کا یہ تصور کہ قوم اپنے تئیں ایک "آبائی وطن" ہے جس میں افراد کا ظہور مجازی ہے اور وہ اس لائق ہے کہ اس کی ہر خوشی قربان کردی جائے، اگر افراد حقیقی نہیں پھر ملت کیونکر حقیقی ہوئی؟۔ باہمی تعاون کا ایک حقیقی رشتہ جو فرد اور ملت اور ملت میں ہر لحظہ موجود ہے کسی طرح جھٹلایا نہیں جاسکتا، اس کے منکر ہی اس جنگ کے بانی ہوئے تھے اس دنیا کو باہمی تعاون اور بقائے باہمی ہی کی ضرورت ہے اور اس طویل عالمگیر جنگ کا گٹ اور ماحصل بھی اسی قدر ہے، اس جنگ کے بڑے بڑے عالمگیر نتائج رونما ہوئے ہیں اور دنیا کی مظلوم اور پسماندہ اقوام اس سے

بڑی حد تک مستفیض ہوئی ہیں، لیکن تاریخ کی رفتار حیرت انگیز ہے کیونکہ اسکی اپنی مخصوص رفتار ہے اور اسکی اپنی منطق ہے لہٰذا اسے انسانی منطق سے یا کسی قوم و ملت کے منطقی جذبات سے کوئی ہمدردی نہیں، ایک دن اس نے کس ذوق و شوق سے انگریزی ملوکیت کو جنم دیا تھا اور پھر اس نے آج اپنے ہی ہاتھوں اس کا تختہ الٹ دیا، کہنے کی بات نہیں اسنے کس دیدہ دلیری سے شرق الہند کے جزایر میں فلفل کی تجارت کو ایک بہانہ بنا کر ان جزایر پر اور جنوبی ایشیا کے اوپر مغربی استعماریت کی لعنت مسلط کر دی تھی، پھر اسنے کس ادا کے ساتھ اسکے شہنشاہوں کو تخت سے اتار کر تختے کا محتاج کر دیا، گویا تاریخ ایک خلا ہے جس کو عقل سے پر نہیں کیا جاسکتا اور اسکے سر ہی سر ہے عقل ندارد اور عقل کی اسے ضرورت ہی نہیں جبکہ بغیر عقل کے ہی وہ بڑے بڑے سرکش اور خونخوار اژدہوں کو رام کر سکتی ہے باایں ہمہ تاریخ محض ایک بھونڈی اندھی طاقت بھی نہیں، اس میں ایک حسن، ایک بانکپن، ایک شان، ایک تمکنت بھی ہے، اس میں اگر صداقت کے امتحان کی آزمائش ہے تو ایک عزم، یقین، استقلال اور استحکام بھی ہے تاریخ کی رفتار اگر فلسفی کے تخیل کی طرح فلک گیر اور فلک سیر ہے تو یہ زمین گیر اور زمین تاز بھی ہے، کیونکہ جغرافیہ اور ماحول اس کے میدان ہیں اور عزم اور یقین اس کے مرد میدان ہیں، تاریخی عمل کوئی طلسم ہوشربا نہیں اور نہ ہی یہ کسی یا چند متنفس کا کوئی معجزہ ہے، یہ ایک عظیم طاقت ہے جو وقت کی رفتار سے عمل پیرا ہے، یہ طاقت کبھی مرتکز ہوتی ہے اور کبھی منتشر، اور وہ طاقت مخصوص حالات میں کسی ناسازگار اور مستبد ماحول سے ایک مکمل وحدت کی تکوین ہے

جس طرح انگریزی ملوکیت ہند کی منتشر شدہ قومیت کا ایک کرشمہ تھی اسیطرح ہند کی وحدت ملی انگریزی شہنشاہیت کی ایک شاہکار تھی، ہماری صدیوں کی منتشر شدہ قومیت کی شیرازہ بندی اسی شہنشاہیت نے کی تھی اور یہ ایک خالص تاریخی عمل تھا کہ یہ شیرازہ بند جمعیت جو اسی کی پیداوار تھی اس کے استیصال کا سبب بنی تھی، مزید براں تاریخ نے آزادی ہند کی جنگ کا ایک اہم معرکہ یورپ میں اور مشرق جنوبی ایشیا میں سر کیا تھا پھر اس نے اس سرکش اور خونخوار ملوکیت کی میت کو اپنے دوش پر اٹھائے جزائر برطانیہ میں لے جاکر دفن کیا تھا، اس کی تکفین وتدفین فرشتوں نے نہیں بلکہ دو طاقتوں نے کی تھی ــــ ان میں سے ایک انسانی سوشلزم کا ہیکل تھا اور دوسرا جمہوریت کا پیکر تھا، اور تاریخ کے تنازع البقا میں یہ انتخاب طبعی کا ایک عمل تھا۔

پھر اس لحاظ سے اس جنگ کا موجد اڈالف ہٹلر اگر خراج تحسین کا مستحق ہے تو اس جنگ کا ایک اہم کردار سر ونسٹن چرچل بھی یقیناً تہنیت کا سزوار ہے سر ونسٹن بھی اپنی ایک منفرد شخصیت کے مالک تھے، ان کی نگاہیں دور رس رمز آشنا اور قیافہ شناس تھیں، فطرت نے انہیں پیش بینی کے کچھ ملکوتی جوہر سے آراستہ کیا تھا، انکی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ واقعات کو سرزد ہونے سے ہفتوں مہینوں اور کبھی کبھی سالوں پیشتر ہی دیکھ لیتے تھے اور پیش گوئی کر دیتے تھے اور لطف یہ کہ اگر وہ واقعات پیش نہیں آتے تو وہ اپنی منفرد قابلیت سے ان کے نہ پیش آنے کے وجوہات کو اٹل دلائل سے پایہ ثبوت تک پہونچا دیتے تھے۔ آپ کہئے بات دلچسپ ہوئی کہ نہیں؟ ــــ ان کے بارے میں آپ کے خیالات

خواہ کچھ ہی ہوں لیکن ان کی ایک پیشین گوئی بالکل صحیح نکلی تھی، وہ جو انہوں نے عنانِ اقتدار سنبھالتے کہہ دیا تھا کہ فتح آخر ہماری ہوگی، اور فتح ان ہی کی ہوئی تھی، لیکن حقیقت احوال دیگر گوں تھی، جنگ وہ جیت گئے تھے لیکن وہ جیت درحقیقت شکست کے مرادف تھی، کیونکہ اس جنگ میں ان کی قوم نے حفظ ناموس کی خاطر جان و تن، سرمایۂ دولت، املاک و اثاثہ سلطنت اور ڈومینین عظمت و شوکت، سطوت و صولت، غیرت و جبروت، مشیخت و بزرگی تک کی بازی لگا دی تھی، باوجود اس عظیم قربانی کے وہ تاریخ کا دھارا نہیں بدل سکی تھی، اور آج برطانیہ عظمیٰ کی سطوت کا ستارہ غروب ہوتا جارہا ہے اور اس کے اقبال کا نیر درخشاں تیزی کے ساتھ نصف النہار سے ڈھلتا جارہا ہے آج اس ضعف کے عالم میں کوئی بھی اکسیر اسے جوانی کی امنگوں سے دوبارہ معمور نہیں کر سکتی۔ اس کے کچھ صحیح اسباب ہیں، اور وہ ہیں اس کے اپنے جغرافیائی پلاننگ کا فقدان! برطانیہ عظمیٰ اپنے جغرافیائی پلاننگ سے منحرف ہو کر دور مستعمرات اور مقبوضات میں اپنا بیش بہا وقت ضائع کر رہی تھی، اور بہتیری قوموں کے حق خود ارادیت پر مداخلت اور دست اندازیاں کر رہی تھی اور اپنے مستقبل سے یکسر غافل ملک دشمن طاقتوں کی تخلیق کر رہی تھی۔

"یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد!"

اب آپ دیکھیے کہ اس پیش بینی کی یہاں ضرورت تھی اور اس کی ضرورت صرف سر ونسٹن کو ہی نہیں تھی بلکہ پہلی عالمی جنگ کے ہیرو اسکوتھ لائیڈ جارج اور ان کے بعد کے بہتیرے جلیل القدر مدبرین کو تھی۔ خیر جو ہونا تھا سو ہوچکا اب ضرورت ہے

دل تھام کر اس گرتی ہوئی عظمت کا دامن تھام لینے کی۔

"دل کو تھاما ان کا دامن تھام کے
اپنے دونوں ہاتھ نکلے کام کے"

بایں ہمہ ہیروشنگٹن صفاتی طور پر یگانۂ روزگار تھے، ان کی زندگی تاریخ کا ایک مرقع تھی، ان کی زندگی کا مطالعہ ہمارے لئے اہم ہے کیونکہ اس کے بغیر ہم تاریخ کے صحیح عناصر کو نہیں سمجھ سکتے، ان کی زندگی کی تاریخ ہمیں انسانی زندگی کی تاریخ میں بہت قریب سے جھانکنے کے مواقع فراہم کرتی ہے ان کی ذات رفعت مآب برق کی طرح روشن ستارے کی طرح بلند اور چاند کی طرح منور تھی، وہ اپنی شخصی عظمت اور حسن سیرت کے نشان اور ایک پیکر مجسم تھے، اور اس لحاظ سے انہیں تاریخ کبھی بھلا نہیں سکتی، کوئی شخص خواہ کتنا ہی بلند ہو اور ذاتی اور صفاتی طور پر کتنا ہی ارفع ہو اپنے خادم کی نظر میں ہیرو نہیں لیکن جب ہم سروشنگٹن کی صفات عالیہ پر غور کرتے ہیں تو یہ صداقت اکیدم ماند پڑ جاتی ہے اور بے ساختہ ہماری زبان سے نکل جاتا ہے کہ سروشنگٹن ہر حال میں ایک ہیرو تھے، سروشنگٹن کیا کچھ نہیں تھے، وہ مسیح کی طرح مقدس، فرشتے کی طرح پاکیزہ اور شیر خوار بچے کی طرح معصوم تھے، انکی شخصیت کی عظمت جسطرح ہاؤس آف کامنز، ہائڈ پارک گیٹ، اور ڈاؤننگ اسٹریٹ کے فلک بوس ایوانوں میں ناہید کی طرح رقصاں و تاباں نظر آتی تھی تو اسیطرح چارٹ ول کے فارم میں ان کی سیرت کی چمک اور دمک نگاہیں خیرہ کئے دیتی تھیں، کیا مسز چرچل، کیا ان کے نصف درجن سکرٹری، کیا ادنیٰ سے

ادنیٰ خدام، کیا سویزرلینڈ کی طباخ خواتین، کیا جاروب کشی کے کام پر مامور انگریزی
خواتین ہر متنفس ان کے حسن سیرت کی چوٹ کھائے بیٹھا تھا، وہ ہائیڈ پارک
ڈاؤننگ اسٹریٹ یا ہاؤس آف کامنز میں اپنے علم وفضل، شان وتمکنت سربلندی
اور بے نیازی کے جذبات میں سرشار بڑے بڑے جلیل القدر اکابرین کا سر نیاز
خم کر سکتے تھے تو وہ چارٹ ول میں جاروب کشی کے عہدے پر مامور کسی انگریز خاتون
سے ایک انشراح قلب کے ساتھ پیش آنے میں مجبور ہوتے تھے اور مزاج پرسی
اور تسلیمات بجالانے میں اس سے سبقت لے جانے کے لئے سدا کوشاں رہتے تھے
اور کوئی حقیر انسان ان کے اس جذبہ کو اپنی عزت کا تمسخر اڑانے کے مرادف نہیں
سمجھتا، البتہ کبھی کبھی لطف ومحبت کے جذبے سے سرشار ہو کر اگر وہ مسز
چرچل کو "پیاری بلی" کہہ ڈالتے تھے تو اسکے جواب میں مسز چرچل انہیں برجستہ
"پیارے خنزیر" کا القاب عطا کر دیتی تھی تو وہ آتش زیر پا نہیں ہو جاتے تھے
بلکہ ان کے جذبے کی قدر کرتے تھے اور مسرت سے جھوم جاتے تھے، وہ کبھی کبھی
اپنی دختر نیک اختر مس میری کو "چمپ" (بن مانس) کہہ دیتے تھے اور مس
سارا کو کسی صحرائی جانور سے ملقب کر دیتے تھے، اس قسم کے تفنن ان کی خانگی
زندگی میں درحقیقت ہاؤس آف کامنز کی سنجیدگی اور گہرائی سے کم اہمیت نہیں
رکھتے تھے۔

حضرت برطانیہ کے وزارت عظمیٰ کے جاں طلب منصب پر فائز تھے
اور اسکے شکنجے میں اسطرح جکڑے ہوئے تھے کہ بستر سے اسٹڈی اور اسٹڈی
سے حمام تک مجال دم زدن نہیں رکھتے تھے، کبھی کبھی انہیں حمام خانے کے

ٹب سے بھی ہاؤس آف کامنز میں دی جانے والی کسی اہم تقریر کے ڈکٹیشن دینے
کی ضرورت پیش آجاتی تھی، اور کبھی کبھی تو حمام خانے سے ہاؤس آف کامنز کو
خطاب کرتے ہوئے نظر آتے تھے، محویت، استغراق خود فراموشی اور جذب
کا عالم یہ تھا باوجود اسکے حضرت اپنی مصوری کے لئے وقت ضرور نکال لیتے
تھے اور کسی پیچیدہ سیاسی مسئلے کا حل اپنی تصویر کے رخوں اور زاویوں میں
ڈھونڈ نکالتے تھے ۔ مصوری کی انہیں ایک لت تھی اور اس کے بغیر شاید
وہ اپنی شخصیت کے معراج تک نہیں پہونچ سکتے تھے، وہ کہتے تھے کہ تصویر نگاری
ایک جنگ لڑنے کے مرادف ہے اور اس میں اسیقدر جانفشانی درکار
ہوتی ہے جس قدر کہ ایک معرکہ سر کرنے میں۔ پھر چونکہ فطرت انسانی کے
مطالعہ کے لئے فطرت حیوانی کا مطالعہ از حد ضروری تھا، لہذا حضرت
بہایم کی صحبت سے بھی بہت زیادہ لگاؤ رکھتے تھے، گھوڑے، کتے، بلی
اور مرغان خانہ سے انہیں والہانہ محبت تھی، اس مرغ کی ٹانگ وہ کبھی نہیں
کھاتے تھے جو ان سے بہت زیادہ مانوس ہوتا تھا، ان کے کتے ردفس اول
اور ردفس ثانی کا قصہ انگلستان میں زبان زد خاص وعام ہے، جانوروں
سے شیفتگی اور محبت کا یہ عالم تھا کہ حضرت ہاؤس آف کامنز سے کتنی ہی اہم
تقریروں کے دوران میں فون پر ان کی نگرانی کی تلقین کرتے رہتے تھے
جس میں ردفس کا ذکر بالخصوص ہوتا تھا، پھر وہ اپنی مچھلیوں کو رات کے
پچھلے پہر خود اپنے ہاتھوں سے کھلاتے تھے، اور ردفس اول کی موت پر تو
انہوں نے صف ماتم بچھا دی تھی، پھر میکی جو ان کی پیاری بلی تھی جو کبھی کبھی

اپنی آوارہ گردی کے دوران میں انہیں داغ مفارقت دے جاتی تھی تو
وہ کھوئے کھوئے سے رہتے تھے اور میکی کی جدائی ان کے لیے اسقدر
سوہان روح ہوتی تھی کہ کبھی کبھی بڑے بڑے پرنس، ڈیوک، مارکویس، ارل
وسکاونٹ اور اہم سے اہم شخصیتوں کے آگے اہم سے اہم مسایل سے قطع نظر
میکی کی فرقت کے غم کا اظہار کر دیتے تھے اور وہ ان کا منہ تکنے لگتے تھے۔
اب آپ کہئے یہ انسانی تاریخ کا ایک روشن منور جامع اور اہم کردار ہے
کہ نہیں ؟۔

۲-

عالمی جنگ ۲

قصۂ پارینہ المختصر یہ کہ گذشتہ عالمی جنگ کے دوران میں صحرائے مغربی کے اس طوفان بدتمیزی کے اکھاڑے میں جس کو "تھیٹر آف آپریشن" کہا جاتا تھا ایک دن ایک بیک ہی آرمرڈ کاروں، کیریریوں اور عفریتی ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ بند ہوگئی تھی، تیز رفتار فائٹروں اور بمباروں کے فارمیشن فضاؤں میں مائل پرواز نہیں نظر آتے تھے، اٹھاسی اور سو ملی میٹر کی توپوں نے آگ اگلنا موقوف کر دیا تھا۔ اور دور افق سے امن و سکون کے بادل لہراتے نظر آئے تھے۔ صحرائے اعظم کی مسلمہ تعریف میں ایک بڑی صفت تھی اس کی ویرانی اور ویرانی کا یہ عالم تھا کہ اس میں آبادی کا نام و نشان تک نہیں تھا، اور نباتات ریگ رواں میں اُگ ہی نہیں سکتے تھے، لہٰذا نگاہیں ترستی تھیں ایک عدد گھاس کے مشاہدہ تک کو، پھر ریگ رواں کی کچھ امکانی توتیں تھیں اور اس کا ایک واحد کرشمہ تھا کہ آپ جو اس وقت ایک

ہموار میدان پر سیر و تفریح کر سکتے ہیں اس کیلئے کوئی بڑی بات نہیں اگر وہ
شب بھر میں اُن پر بے شمار ریگستانی پہاڑیاں تعمیر کر ڈالے، اور شب کو خطرہ
لاحق ہوتا تھا کہ کہیں ہم جس ریگ رواں کے سطح میدان میں خیموں کے نیچے
پناہ گزیں ہیں اس پر کسی وقت بھی شب کی تاریکیوں میں باد صرصر کی سازشوں
سے ریت کے سینکڑوں پیرامڈ یا اہرام بن سکتے ہیں، اور ہم ان کے نیچے نظری
طور پر دفن بھی ہو سکتے ہیں، اس قسم کے سطحی تغیرات صحرائے مغربی کی عام
خصوصیت تھے، لیکن خیر ہے ہم کبھی مدفون نہیں ہوئے تھے، البتہ صبح کو ہم
جو جاگتے تھے تو اپنا جغرافیائی ماحول غیر مانوس اور غیر متعارف محسوس ہوتا
تھا، اور ان تغیرات کی بنا پر کتنی ہی دفعہ ہم سیر و تفریح سے لوٹتے ہوئے اپنے
مستقر اور مسکن کو بہ مشکل ڈھونڈ نکال سکتے تھے، یہ ریگ رواں کے ٹیلے اہرام
مصر کے مشابہ ہوتے تھے اور شاید عہد قدیم میں شاہان مصر نے جو اہرام
بنوائے تھے ان کی تعمیری اشکال نظری طور پر ان ہی ٹیلوں سے ماخوذ تھیں، اور
اس قدیم ترین تہذیب کے ذہنی ارتقا کے اوائل کے پیش نظر اس قیاس کو
تقویت پہونچتی تھی، پھر ریگ رواں کے کچھ نظارہ فریب مناظر تھے اور
وہ سیمیا اور سراب محض تھے جو کبھی بہتے ہوئے دریا کے مناظر پیش کرتے
تھے اور کبھی الماس زاروں کا سراغ بتاتے تھے جو ایمائے محض تھے جن کے
درپے ہونا ہلاکت کا سبب ہو سکتا تھا۔

اس ریگ رواں کے لامتناہی سلسلے کے پس منظر میں شمال کی جانب
سبز پانی کا ایک وسیع سلسلہ تھا جو میڈیٹرینین سی کہلاتا ہے، کبھی کبھی ساحل

پر قیام ہوتا تھا اور نگاہوں کو اس سلسلۂ آب کی سبزی سے کسی قدر سکون مل جاتا تھا، ورنہ تنگ آ گئے تھے ریگ رواں کی روانی کا مشاہدہ کرتے کرتے۔ اس ریگ رواں کے سمندر میں ایک مدت کے بعد کالے کالے وسیع خیمے نظر آئے تھے، یہ خانہ بدوش لیبیائی بدوؤں کے خانۂ بے سر و سامان تھے، یہ اس بات پر روشنی ڈالتے تھے کہ اب مزید خطرہ نہیں اس وقت امن و سکون کا دور دورہ ہے، ورنہ اس صحرائے اعظم میں "کیموفلیج" کی سخت ضرورت ہوتی تھی کہ لباس ریگستانی رنگ کے اور چھوٹے چھوٹے خیمے بھی رنگ کے علاوہ حالت میں ریگ رواں کے مشابہ ہوتے تھے جن کے سایۂ عاطفت میں رہ کر کچھ ناگہانی بلاؤں سے محفوظ تھے، یعنی کہ بالائی فضا سے کسی مخدوش ایر کرافٹ کو ہمارا پتہ چلنا مشکل ہوتا تھا اور ہم آسیب آسمانی سے یکسر محفوظ تھے، اول اول جنگ کے دنوں میں جرمنوں سے عقلمندی یہ سرزد ہوئی تھی کہ انہوں نے بدوؤں کے چمکدار کالے کالے اکے دکے خیموں پر بمباری کر دی تھی، اور بالائی فضا سے انہوں نے سمجھا تھا کہ بڑا میدان مارا ہے، اور بدو لاکھ عقلمند سہی اور لاکھ دیکھتے رہے تھے پر انہوں نے نہیں سمجھا تھا "کیموفلیج" کی مصلحت کو اس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ افلاک سے فولاد کی معیت میں ایک دن آتش غضبناک نازل ہوئی تھی، کچھ تو راہی ملک عدم ہوئے تھے اور باقی جو بچے تھے سارے کے سارے صحرائے اعظم سے رخصت ہوتے نظر آئے تھے، ان کے قدم بابرکت کے اٹھ جانے کے بعد لے دے کر ہم لوگ ہی صحرائے اعظم کے نام لیوا رہ گئے تھے، ہم جو وطن کو صحیح سالم لوٹے ہیں تو ہمارے اس لوٹنے میں کیموفلیج کا پورا

پورا دخل نظر آتا ہے۔ اب جو خیر سے بدو لوٹ رہے تھے ہم نے سمجھا تھا اور معلوم بھی ہوا تھا کہ ہم لوگ بھی لوٹ جائیں گے۔ اپنے خاک وطن کو جس کا ذرہ ذرہ اس وقت دیوتا کی طرح جچتا تھا۔ لیکن انگریزوں کی کارستانی کے برخلاف ہمیں قدرت کی ستم ظریفی کا زیادہ دخل نظر آتا تھا کہ مرحلے تمام نہیں ہوئے تھے اور فرحت کا اہتمام ہنوز باقی تھا۔ اور ہمیں اس سلسلۂ آب کو عبور کرنا پڑا تھا، اور ہم سوچ رہے تھے کہ اس پُر خطر سلسلۂ آب کو جس میں سرنگیں پوشیدہ کی گئی تھیں عبور کرنا بمقابلہ صحرائے اعظم کے سراب عبور کرنے کے کسی قدر آسان تھا۔ لیکن ہم یہ بھی سوچ رہے تھے کہ جب سرکش انگریز، امریکن، کناڈین آسٹریلین اور نیوزی لینڈرس من حیثیت الجمعیت میدان جنگ میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے اور ان کو اپنی نگاہوں میں عرصۂ آفاق تنگ نظر آتا تھا۔ اس مہم کو ہنستے کھیلتے بحسن لیاقت سر کر سکتے تھے، پھر ہم خاک نشینوں کو زحمت سفر دینے کی کیا ضرورت تھی، لیکن بات یہ نہیں تھی، ہند کے خاک نشیں جانفروشی اور جگرداری کے میدان میں کچھ ایسی روایت قائم کر چکے تھے کہ انگریز ان کے بحد معترف تھے، اہم سے اہم اور سنگین سے سنگین مورچے انہوں نے سر کئے تھے۔ دریاؤں کو وہ عبور کر جاتے تھے، پہاڑوں اور کوہساروں سے وہ گذر جاتے تھے، سنگلاخوں، چٹانوں، خارزاروں اور گھنے گھنے جنگلوں کو وہ طے کر جاتے تھے وہ توپ کے گولوں مارٹروں اور مشین گنوں کی گولیوں کی بوچھاڑوں میں دشمن کی چوکیوں پر چڑھ دوڑتے تھے، جان دیدیتے تھے لیکن باز نہیں آتے تھے، انکی سرفروشی اور جاں سپاری اس درجہ کی تھی کہ دشمن کا دل دہل جاتا تھا کیرن اور راس الزندی کے مورچوں پر مارٹروں اور

مشین گنوں کی گولیوں کی بوچھاڑ میں انہوں نے بے جگری اور جانبازی کی ایسی مثال قائم کی تھی کہ یہ ہو نہیں سکتا تھا کہ وہ اٹلی کی مہموں میں نظر انداز کر دیئے جاتے اور یہ ہو نہیں سکتا تھا کہ اٹلی کی سرزمین میں سینو دریا کے مورچوں پر اور گاری دریا کے مہموں میں انہیں استعمال نہ کیا جاتا، اور انہیں ان مورچوں پر استعمال جو کیا گیا تھا اور انہوں نے شجاعت اور سرفروشی کا کچھ ایسا مظاہرہ کیا تھا کہ جرمنوں کے پائے استقامت میں تزلزل آ گیا تھا اور ان کی قوت مزاحمت جڑ سے جواب دے گئی تھی، اس کے بعد تو وہ کسی دوسرے مورچے پر قدم جما کر نہیں لڑے تھے، بلاشک بحری بیڑے کے استعمال میں اور نیچ لینڈنگ کے مراحل میں سفید اقوام نے جو کارنامہ انجام دیا تھا وہ انہی کا حصہ تھا، اور بلا شرکت غیر اس امتیاز کا طرہ انہی کے سر باندھا جا سکتا ہے، اور بلاشک فتح و ظفر اور نصرت و کامرانی سفید افواج کی عدیم النظیر شجاعت اور بہادری کی شاہکار تھی، لیکن حق یہ ہے کہ ہند کے خاک نشین کہیں کہیں ان کے لئے فتح و نصرت کی کلید کے طور پر استعمال ہو جاتے تھے، وہ اپنی جانیں دیدیتے تھے اور ان کے لئے نصرت و کامرانی کا دروازہ کھول دیتے تھے، اس جنگ میں فضائی بیڑوں کا کردار اہم تھا اور انہوں نے اہم سے اہم کارنامے انجام دیئے تھے باوجود اس کے یہ زمینی معرکے زیادہ اہم تھے اور اس عالمی جنگ کی ساری عظمت یہیں مضمر تھی۔ یہ دست بدست کی جنگ تھی، اس میں براہ راست شجاعت سرفروشی اور جانبازی درکار تھی، آج کی مشینی جنگ ہو یا آئندہ کی ایٹمی جنگ ہر جنگ میں جنگ کا یہ حصہ نہایت اہم ہے، اس کے بغیر جنگ نہیں

اور فتوحات نہیں، اور یہیں وہ میدان ہے جہاں کسی قوم کی قوت معنوی کا پتہ چلتا ہے، اس میدان میں بھی ہندوستانی فوجوں نے ایک اہم کردار نبھایا ہے۔

ابتک ہم چند سمندروں کو بے سپر کر چکے تھے، حد نظر میں خشکی کا ایک سلسلہ تھا جس کے گھوارے میں لے دے کر زیادہ سے زیادہ پہاڑ، دریا، جھیل صحرا یا میدان ہی رہ گئے تھے اور تخیل کی باریکی کا یہ عالم تھا کہ پہاڑ اس وقت متغزلین کی طرح ریزۂ سنگ سے زیادہ نہیں جچتے تھے، رہے دریا جھیل صحرا یا میدان تو وہ حسب مراتب قطرۂ آب یا مشت خاک ہی نظر آتے تھے لیکن ان مراحل کو طے کرنا پڑتا تھا، اور قدرتی طور پر مرحلہ پیمائی کی ساری دقتوں اور صبر آزمائیوں سے بہرہ اندوز ہونا پڑتا تھا، اور ہم وہ راہ پیما تھے جس کی راہیں زمانے کی رعایت سے پاؤں کے چھالوں کا علاج نوک خار نہیں تھے بلکہ جان لیوا "مائینس" یا "بوبی ٹریپس" تھے، پھر قیامت کی برفباری تھی۔ باد صرصر کے طوفان تھے اور باد مغربی کے تند و تیز جھونکے تھے جو رگوں میں خون سرد کئے دیتے تھے اور ہر جانب سے تیر چلاتے تھے۔

قدرت ہمارے ساتھ پیہم مصروف جنگ تھی اور ہم خلاف فطرت اپنے جیسے انسانوں سے سرگرم جنگ تھے، قدرت کے مناظر ہماری نگاہوں کے آگے رقص کرتے تھے اور ہمیں ملامت کرتے تھے اور منفعل کرتے تھے، اور دل میں تمنائیں اٹھتیں کہ کاش ہماری زندگی کے لمحات اس جنگ کی ہولناکیوں اور آل آدم کے قتل و غارت کا منظر دیکھنے کے بجائے سیر و سیاحت کیلئے وقف ہوتے

اور کاش ہماری نگاہیں اٹلی کی جنت نشاں سرزمین میں بہتے ہوئے خون کی نہروں کی روانی نہ دیکھ کر قدرت کے ان گرتے ہوئے آبشاروں اور پیہم رواں سرچشموں اور جھرنوں کا ملاحظہ کرتیں اور کوہستانی سلسلوں اور وادی کہسار کی گلستاں سامانیوں کا مشاہدہ کرتیں اور فطرت کی لالہ کاریوں سے فردوس بداماں ہوتیں، لیکن جنگ کی لالہ کاریوں نے فطرت کی لالہ کاریوں کو پس منظر میں ڈال دی تھیں۔ یہ خونچکاں اور جانستاں منظر اسقدر، دلدوز اور دل فگار تھا کہ چشم افلاک سے خون کے آنسو رواں تھے، اور بالآخر جب ہم نے اٹلی کی نوعروس کو اس کے گلستانوں میں خونیں کفن سے ڈھانپ دیا تھا تو کائنات کا ضمیر لرز گیا تھا، اور چاند ستاروں کا دل دہل گیا تھا، اور ہم دل تھام کر بیٹھ گئے تھے، اس قتل و غارت کے ہولناک منظر سے سنگدل سے سنگدل انسان کا دل پسیج جاتا تھا، اور کٹھور سے کٹھور نگاہیں اشک خون بہاتی تھیں، غیروں کا ذکر کیا کچھ انگریز بھی ایسے ہوتے تھے جن کی زبانوں سے صداہائے زنہار بلند ہوتی تھیں، اور ان کے لب کسی قدر مبتذل انداز میں نغمہ پیرائی کے لئے مچلتے ہوتے۔

” زنہار زنہار ! ـــ اور پھر جو کبھی ـــ چند لوگوں کی خاطر ـــ اتنے سارے لوگ ـــ اتنی ساری مدت ـــ اتنی حقیر شئے کیلئے ـــ اس شغل شنیع کا ـــ ارتکاب نہ کریں گے !! “

یہ برگشتہ قسمت اٹالین قوم کی قتل و غارت کا خونیں ڈرامہ تھا، اس ڈرامے کے بیچ شدید ناکامی اور نامرادی کے عالم میں جرمن فوج پسپا ہو رہی تھی

دل ان کا شکست کے احساس سے چور چور تھا، لیکن غیرت ان کا دامن
نہیں چھوڑتی تھی، اگرچہ جرمن جنگ میں پسپا ہو رہے تھے تاہم ان کی
شجاعت اور سرفروشی قابل داد تھی، اب بھی انکے دم خم کا یہ عالم تھا کہ وہ
دشمن کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور وہ سزاوار تحسین تھے کہ اس حالت میں
بھی جو کسی مورچے پر اڑ جاتے تھے تو بڑی بڑی جمعیت دہل جاتی تھی، وہ
اپنی رائفلوں اور مشین گنوں کی آخری گولی تک صرف کر دیتے تھے اور ہتھیار
نہیں ڈالتے تھے تاوقتیکہ جان میں رمق باقی ہے، مورچہ ترک نہیں کرتے
تھے تاوقتیکہ مورچہ سر ہونے کے بعد انہیں کھینچکر مورچوں سے نکال نہیں دیا
جاتا تھا، اور قطع نظر ان کی شجاعت اور بہادری کے یہاں خالص جنگی
"ٹیکٹکس" کو عمل میں لایا جاتا تھا، اس جنگ میں سب سے زیادہ قابل
نفرت اور بزدلانہ شئے فضائی بیڑہ تھا، یہ سب سے زیادہ ہولناک سفاک اور
خونریز تھا، اور فضائی بیڑہ کے استعمال میں ضرورت سے زیادہ فیاضی سے
کام لیا جاتا تھا، اس کی تباہ کاریوں کے شکار یوں تو انسان ہی تھے، لیکن
اس کی زد سے حیوانات، نباتات، جمادات اور حشرات الارض تک کو اماں
نہیں تھی، اسنے روئے زمین کا نقشہ بگاڑ دیا تھا، بمباری جو کی جاتی تھی تو
لگاتار گرد و نواح کے حسین حسین شہر خاکستر کے ڈھیر بنا دیئے جاتے تھے
یہ شہر صدیوں میں بسے تھے، لیکن انہیں کس بیدردی سے مسمار کیا جا رہا تھا کہ
اس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں، فضائیہ کا اسطرح کھلے بندوں بے محابا
اور بے دریغ استعمال حد درجہ سنگین اور المناک تھا، ضابطۂ اخلاق اور

انسانیت کی رو سے سراسر ناروا ناجائز اور غیر مہذبانہ فعل تھا چند اہم تاریخی شہر روم، نیپلس وغیرہ کو چھوڑ کر جنوں شہر کی یہ حالت بنائی گئی تھی کہ ان کی عمارات کا ذکر کیا ان عمارات کی ایک ایک اینٹ مسلم نظر نہیں آتی تھی خطا مسولینی کی ہو سکتی تھی، لیکن اس سفاکی اور درندگی کا کیا جواب ہو سکتا تھا کہ اٹلی کے معصوم اور امن دوست شہری اپنی املاک و اثاثہ کو آگ کا ایندھن بنا رہے تھے، اور چھوٹے چھوٹے معصوم بچے کمسن لڑکے اور لڑکیاں مرد عورتیں اور ضعیف اور ناتواں انسان نزع کی حالت میں گرفتار تھے اور کس مپرسی کی موت مر رہے تھے، ان کا خون اس ارزانی سے بہایا گیا تھا کہ اٹلی کی سرزمین لالہ زار بن گئی تھی یہ ایسا ہولناک اور دلدوز منظر تھا کہ دنیا کی ساری چنگیزی اور نادر شاہی اس سے دہل گئی تھی، اور دل خون ہو گیا تھا کہ چند خود پرست شاطر سیاست دانوں کی وحشت ناکیوں کی خاطر عالم انسانی نے کس قدر سنگین قربانی پیش کی تھی، اس سنگین جرم کی مرتکب بحریہ، فضائیہ اور فوج نہیں تھی بلکہ اصل مجرم وہ سیاست داں تھے جو دور بہت دور فلک بوس ایوانوں میں فروکش تھے جہاں جنگ کی آنچ نہیں پہونچی تھی، اور نفرت ہوتی تھی ان بلیک میلروں سے جنہوں نے عالم انسانیت کی پیٹھ پر چھرا گھونپا تھا۔ یہ معاملہ دراصل البانیہ، چیکوسلاواکیہ سڈیٹن لینڈ۔ ڈینزگ، کو فیسزم اور نازی ازم کی تاخت و تاراج سے نجات دہانی کا نہیں تھا اور نہ ہی معاملہ "عالم جمہور" اور عالمگیر امن" کی بقا کا تھا، اگر یہ مسئلے پیش نظر ہوتے تو ہرگز ہرگز ایک دنیا اس عالمگیر جنگ کی لپیٹ میں نہ ہوتی معاملہ درحقیقت

یوں تھا کہ ابتک انگریز دنیا کے کثیر حصے پر حاوی تھے۔ بہتیرے ممالک
ان کے زیر نگیں تھے اور بہتیرے ممالک پر انکی دراندازیاں مویشی کے
کٹہرے میں کتے کے فروکش ہونے کے مرادف تھیں، نتیجہ یہ ہوا تھا کہ
جرمنی اور اٹلی کو انگریزی ملوکیت کی جارحانہ توسیعت اور مداخلت سے
سخت خطرہ لاگو ہوا تھا، انگریز اپنے نوآبادیاتی نظام کی توسیعت سے
اور اپنی مداخلت اور دراندازیوں کی جارحیت سے اور "تجارت غلامی"
کے ہتھکنڈوں سے ساری دنیا کو نگل جانے کے پھیر میں تھے جس کا نتیجہ یہ
ہوا تھا کہ ان قوموں کی صنعت اور تجارت اور خود ان کی "ساورنٹی" ان کی
اس جارحیت کی براہ راست زد میں آنے لگی تھی اور مستقبل قریب میں انہیں
اپنے وجود ہی سے ہاتھ دھو لینے کا قوی امکان نظر آنے لگا تھا، پس ان
قوموں نے اپنے وجود کے تحفظ کی خاطر اپنی "فتوحات" کی مہم شروع کر دی
تھی، مذکورہ بالا ملکوں میں سے کچھ ملکوں پر تو وہ "الارض للہ" کا نعرہ
لگاتے ہوئے چڑھ دوڑے تھے اور کچھ ملکوں پر "جدی میراث" کا دعویٰ
کرتے ہوئے قابض دخیل ہو گئے تھے، یہ دور فتوحات کا تھا اور فتوحات
کے میدان میں انگریز کبھی یہ گوارہ نہیں کر سکتے تھے کہ کوئی ان کا حریف ہو،
لیکن تاریخ پلٹا کھا رہی تھی اور یہ تاریخ کی رفتار تھی، انگریز اور اس کے
حاشیہ نشینوں نے تاریخ کو چیلنج کیا تھا اور اس کا دھارا بدلنے کے لئے اس
جنگ کی طرح ڈالدی تھی، پھر تو ان کی زبان سے کتنے ہی سامعہ نواز اور
فردوس گوش نعرے بلند ہوئے تھے "بقائے جمہور" اور "بقائے امن" کی

صدائیں کانوں میں رس گھولنے لگی تھیں، ان نعروں میں کتنی دلکشی دلآویزی اور جاذبیت تھی کہ ایک دنیا مسحور ہوکر اس ہولناک جنگ کی آگ میں جست لگا بیٹھی تھی، لیکن درحقیقت دنیا کی یہ سنگین غلطی تھی کہ وہ اس "بلیک میل" کا شکار ہو گئی تھی، اور معاملہ یوں پلٹا تھا کہ خطا کسی کی تھی اور گردن کسی کی کٹ رہی تھی اور نتیجہ یہ ہوا تھا کہ دنیا کی سادگی پسند قومیں اور یورپ کے معصوم اور امن دوست شہری ان کی خطاؤں کا کفارہ بن گئے تھے اور پھر آگے چل کر وہ خود بھی اپنی خطاؤں کا کفارہ بنے تھے، اس جنگ کے اختتام کے ساتھ یوروپین فتوحات کا وہ خونیں باب ختم ہوتا ہے، جس کا افتتاح ساڑھے چار صدی قبل واسکوڈی گاما نے کیا تھا، آج وہی انگریز ہیں کہ تیسری عالمی جنگ کا کہیں جو ذکر آتا ہے تو ان کے ہاتھ کانوں تک جاتے ہیں۔

۳۔

پیمانِ وفا۔

درحقیقت اس جنگ میں اپنی حالت کسی مجاہد کی نہیں بلکہ بلامبالغہ ایک مسافر کی تھی، ہم پیہم سرگرم سفر تھے لیکن اس سفر کی کوئی منزل نہیں نظر آتی تھی، اجنبی خطہ ہائے ارض کے سنسان ویرانوں میں جھاڑ زاروں میں شاخساروں میں اور قدرت کے چمنستانوں میں ہم کبھی پناہ گزیں ہوتے تھے کبھی دشت و جبل میں، کبھی صحرا و میدان میں، کبھی شہر قصبات میں سربکف ہوتے تھے، کبھی زیتون اور چیری بلاسم کے آرچرڈ میں نارنگی اور مالٹا کے باغات میں اور انگور کی بیلوں کے احاطوں میں پابدامن ہوتے تھے۔ کبھی ویران قصبوں، کبھی غیر آباد کوچہ و بازار کبھی آباد ویرانوں اور آباد شہروں میں دل گرفتہ اور سرگشتہ ہوتے تھے۔ رومتہ الکبریٰ کے کوچوں اور بازاروں میں معصومان یورپ کی متجسس نگاہوں میں اپنی حالت بلااختیار اس ملزم کی سی ہوتی تھی جو خون

خلق کے جرم میں ماخوذ ہو، اور خلق کی نگاہوں میں ملعون و مطعون ہو۔ کچھ نگاہوں میں نفرت ہوتی تھی اور کچھ نگاہوں میں حسرت کہ ہم اس قبیلہ رہزنان کے چشم و چراغ تھے جن کی آستین خون خلق سے تر تھی، اور ہم سے حذر لازم ہے، چنانچہ ہم سے دامن بچایا جاتا تھا، اور گریز کیا جاتا تھا، کچھ لب چہ میگوئیوں پر مائل تھے اور کچھ لبوں پر غمگین مسکراہٹیں بکھرتی تھیں، اور ہم ان سے دست بستہ عرض نہیں کر سکتے تھے کہ ہم بے قصور تھے اور اپنی صفائی میں یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ چنگیزی اور سفاکی کی قبا اپنے بدن پر راست نہیں آتی اور حاشا للہ تم دیکھ لو کہ خون خلق ہماری گردن پر نہیں۔

بسا اوقات گھبرا جاتے تھے کہ جدھر بھی گئے ایک ہلچل سا مچ جاتا تھا ہمارا مطالعہ اور مشاہدہ کچھ اس ڈھنگ کیا جاتا تھا کہ کچھ نگاہوں کے عمل جراحی سے اور کچھ نظروں کے پوسٹ مارٹم کے عوامل سے روح فنا ہوتی تھی، اور کچھ حیران ہوتے تھے کہ ہم آخر کوئی شے ہوتے ہیں بے حد اشتیاق انگیز۔ اور کبھی کبھی ٹھیس لگتی تھی ان نگاہوں سے جن میں عفو تھی جو ہمیں فنا کر چکی تھیں، اچٹتی ہوئی نگاہیں چہرے پر گرتی تھیں اور تار دامن میں جا الجھتی تھیں، اور تنگ آجاتے تھے ان نگاہوں سے جو سمائی جاتی تھیں اور ڈرتے تھے کہ وہ ہماری کوتاہی قسمت سے مژگاں نہ بن جائیں۔ اور سخت احتیاط کی ضرورت پیش آتی تھی۔ ہماری حالت اس غیر متعارف ماحول میں اس پہلے انسان کی سی ہوتی تھی جس نے اول اول اس عالم رنگ و بو میں قدم رکھا تھا جو ماں باپ کا مرہون منت نہ تھا، سورج چاند، ستارے نظام کہکشانی اور لامحدود خلائے نیلگوں اس کے لئے سارے کے سارے

اجنبی اور غیر متعارف تھے وہ تنہا ایک متنفس اور خلائے بسیط میں بے شمار تیرتے ہوئے درخشاں ستارے اور چھوٹتے ہوئے ٹوٹنے والے شہاب ثاقب، چاند ستارے لباس نور میں مستور اس خلائے بسیط میں غوطہ زن تھے اور سورج اپنے آتشیں پیراہن میں ملبوس اپنی پہلی پہلی شعاعوں کی لطیف حرارت سے ضمیر کائنات کو توانائی بخش رہا تھا، اور باد مغربی کی تند و تیز لہریں در اصل اسکے لئے پیغام زندگی لائی تھیں، سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا اس کی اٹھتی ہوئی موجیں کف بلب گرج رہی تھیں کہ اے بے نوا انسان تیری خیر نہیں، بادل کی گرج، موجوں کی تڑپ اور بجلی کی کڑک اس بکیس انسان کو نگل جانا چاہتی تھیں، پھر وہ نہ جانے کیوں خود بخود تسخیر ہو گئی تھیں، اس کے قدم چومنے پر مجبور ہوئی تھیں، اور اس کے قدوم سے تو وحشی درندوں نے اپنا مسلک کشت و خون ترک کر دیا تھا، پھر تو بھیڑیے نے بھیڑ کے خون کی قسم کھائی تھی اور طائروں نے قید و بند کی زندگی سے بے فکر اپنے اپنے آشیانوں میں سرور و انبساط کے گیت گائے تھے، اور اس نے پردۂ شب کے سکوت میں ستاروں کی جھلملاتی چھاؤں میں پتوں کی سرسراہٹ کی غیر متعارف صداؤں میں سرور و انبساط کا پیغام سنا تھا، اس لمحہ وہ سوچنے پر مجبور ہوا تھا کہ یہ سارا قصہ اس کی اپنی روحانی طاقتوں کا ایک کرشمہ ہے، اور وہ سب سے یگانہ اور افضل ہے اور پھر دوسرے لمحہ اسے اپنے دل میں ایک خلش محسوس ہوئی تھی اور اسے اپنی ناتمامی کا شدید احساس ہوا تھا، چونکہ بصیرت کی تخلیق نہیں ہوئی تھی لہٰذا یہ خلش اور ناتمامی کی سوزش اسے اپنی ہی تخلیق محسوس ہوئی تھی، جس کا اس کے پاس کوئی علاج نہیں تھا کیونکہ اس وقت تخیل کی بھی تخلیق نہیں ہوئی تھی جو اسکی

رہنمائی کرتا، خندۂ گل اور نالۂ بلبل انجانے طور سے اس کے جگر میں چرکے لگا رہے تھے۔ لالۂ صحرا اور نرگس شہلا کی مخمور نگاہیں اس کے دل کی دنیا کو نہ جانے کیوں تہ و بالا کئے دیتی تھیں ــــ یہ تمام فطرت کے تقاضے تھے، لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ ماجرا کیا ہے، وہ سخت الجھن میں گرفتار رہا تھا اور متفکر سا ہو چلا تھا اور رفتہ رفتہ اس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ پر الم بن گیا تھا۔

لیکن ایک سہانی صبح جب وہ ایک آزردہ خواب سے بیدار ہوا تھا اور وہ غفلت کے شکنجے کو توڑ رہا تھا کہ اچانک اس کا ہاتھ کسی غیر متوقع شے سے جا لگا تھا، اور وہ چونک سا گیا تھا، کیونکہ اسے ایک لمس حاصل ہوئی تھی جو سخت سنسنی خیز تھی ــــ ایک جنس لطیف مخالف جنس کی جو اس کی ہم شبیہ تھی اس کے پہلو پر سوئی ہوئی تھی، اس کا سر اس کے خم کئے ہوئے بازو پر دھرا تھا، اور وہ محو خواب تھی، اس کے شبگوں زلف کی لیٹیں اس کے جسم کو ڈھکے ہوئے تھیں جن کے درمیان سے اس کا گداز جسم زندگی کی حرارت سے دھکتا ہوا جھانک رہا تھا، حیرت تھی اسے کہ اس کے تمام اعضاء بالکل اپنے جیسے تھے لیکن ان میں حسن کی خمیدگیاں زیادہ تھیں، وہ بے خود سا ہو گیا تھا اور بے حس و حرکت پڑا اسے صرف ملاحظہ کرتا جا رہا تھا کہ مبادا اپنے ہلنے جلنے سے وہ دلنواز منظر اس کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہو جائے کہ اتنے میں اس پیکر حسن کی نگاہوں کے نقاب اٹھے تھے اور اس نے ان کی گہرائیوں میں "انوار سماوی" کی مکمل جھلک دیکھی تھی اسے شک ہونے لگا تھا کہ شاید

فلک ٹوٹ پڑا ہے، پھر اس نے ملاحظہ جو کیا تھا تو اس نے تبسم کی ایک ہلکی لہر اس کے لب و رخسار پر مچلتی دیکھی تھی اور دوسرے لمحہ اس کے حسین بازو اس کی گردن میں حمائل ہو چکے تھے اور اس نے اسے سینے سے لگا لیا تھا اور وہ ایک ادائے ناز سے اس سے مخاطب ہوئی تھی۔

"میں ہی تمہاری الجھنوں کا علاج ہوں، میں تمہاری دلدار یار و مددگار اور شریک زندگی ہوں، میرے بغیر تم مظاہر قدرت کو نہیں سمجھ سکو گے، تم ایک مدت تک حیرت میں تھے کہ تمہاری روح میں ایک تشنگی کیا تھی اور ایک داغ ناتمامی تمہیں کیوں مضطرب رکھتا تھا"

وہ ڈر گیا تھا اور اسنے بھاگ نکلنے کی کوشش کی تھی کہ اس کی جکڑ مضبوط تر ہو گئی تھی۔ پھر اس کے نطق کو جنبش ہوئی تھی!

یہ بھاگنے کی ترکیب بھی کیا ——— اب تم ان فرائض ازلی کی انجام دہی سے نہیں بھاگ سکتے جو قضا و قدر نے تم پر عاید کر دی ہے، جانم خدا، تم وہی ہو جس کا نقشہ ہمارے تصور نے کھینچا تھا، تمہارے ہی لئے تو میں اپنی امکانی قوت اور عزائم کی وساطت سے معرض وجود میں آئی، آؤ اب ہم اور تم ملکر اپنی اپنی ادھوری زندگی کی تکمیل کریں اگرچہ تخلیق میں تم سب سے زیادہ افضل تھے تاہم تم سب سے زیادہ نکمے تھے، تمہاری نگاہیں پریشان ہیں اور تم اس پریشانی

کو عبور نہیں کر سکتے، تمہاری زندگی میں ایک خلا تھا جس کو ہم
نے پُر کر دیا ہے۔ آؤ اب تمہیں ہم علم و دانش کے ان جواہر
سے آراستہ کریں جو ہمارے خزانے میں بھرے پڑے ہیں
لیکن تمہیں سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے اور مجھے چھوڑ کر
بھاگنا نہیں چاہیئے کیونکہ ہم اور تم ایک عظیم خلقت کا
افتتاح کریں گے جو ساری دنیا پر حاوی ہو گی اور فضائے
نور میں تیرتے ہوئے سیارے بھی اس کی زد میں ہوں گے
اس عظیم خلقت کی ساری تمنائیں اور مرادیں میرے سینے
میں مرکوز ہیں، اور میرے سینے کے دفینے میں سرور انبساط
کے گوہر چھپے ہوئے ہیں جو ہماری اگلی نسلوں کے لئے وقف
ہیں۔ لیکن میں ساکن ہوں اور تم متحرک! آؤ ہم اور تم باہمی
تعاون کو عمل میں لاویں اور اپنی اپنی ادھوری زندگی کی
تکمیل کریں ـــــ اس وقت ہماری آنکھیں کھلیں گی اور ہم
یقیناً حلقۂ ربوبیت میں داخل ہونگے!" (ماخوذ)

یہاں ہماری نگاہوں میں جو ایک ہنگامہ خیز سحر ٹوٹتا تھا تو یہاں حالت
یہ ہوئی تھی کہ نگاہوں میں انوار سماوی کی جھلک دیکھنے کے سلسلے میں ابساوقات
کچھ نگاہوں کے زاویہ نظر کی پیمائش کرنی پڑتی تھی اور کچھ نگاہوں کی نوازش
ہائے پنہاں اور دعوت نظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے جبلت انسانی سے مجبور کبھی کبھی
شہادت کے باب میں کسی قدر غواصی کرنی پڑتی تھی اور دل کی حرکتوں کا توازن

بگڑنے لگتا تھا۔ اور جب ایک سیمیائے مجسم نے "آسمانی" لباس میں ہمارا دامن تھام لیا تھا اور ہم سے عہد و پیمان کیا جا رہا تھا تو ہمیں سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ محبت کی شرط عہد و پیماں کیونکر ہوئے اور اگر ہوئے تو اخلاص و محبت کی منطق کے کس ذیل میں آتے ہیں۔ اور ہم سمجھنے سے قاصر تھے کہ اہل ذوق کس طرح ایک ہاتھ سے پروانۂ وفا تھامے اور دوسرے ہاتھ سے دل کو تھامے اس دنیا سے سدھار کر "رومانس" کی دنیا میں کوچ کر جاتے ہیں۔ حالانکہ محبت کی دنیا میں یہ سب سے بڑی کمزوری ہے کہ ہم محبت کرتے ہیں تمہاری یقین دہانی پر اور تمہارے عہد و پیماں پر ورنہ ہمارے اندر اپنی کوئی معنوی قوت نہیں۔ استغفر اللہ! — اور جنسی مذاق اور جنسی تعاون کی غایت ہماری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اور سمجھ میں آیا تھا کہ "رومانس" کی دنیا خلائے بسیط میں گردش تو کیا کرتی اس نے ہنوز "کن" کی آواز تک نہیں سنی ہے، اور ہم منازل شناساں گم کردہ پے کے زمرے میں ایسے منزل شناس تھے کہ سخت عذاب میں گرفتار ہوئے تھے اور لائق تعزیر تھے کہ اس شے کو مکانی سمجھ کر اقصائے عالم میں ڈھونڈ رہے تھے جو دراصل ایک غیر مرئی اور لاکائیناتی شے تھی۔

چنانچہ ہم نے اس آسمانی قبا سے عرض کیا تھا:

"پلیز۔ پر فیور ے۔ ہم درد کے ماروں کا اس طرح
تخول نہیں اڑایا کرتے!"

برافروختہ ہو کر جواب دیا گیا تھا:

"پلیز! تم بالکل وہ ہو۔ میں کہتی ہوں میری کس حرکت سے

تحول کا مفہوم نکلتا ہے!"

عرض کیا تھا:۔ "بات دراصل کچھ بھی نہیں ماسوا اسکے کہ غازہ لپ اسٹک اور کیوٹکس دراصل رنگ ہیں اور بذات خود کوئی شے نہیں لیکن رنگ سے ذرا دھوکہ ہوتا ہے اور درحقیقت میں وحشت ہونے لگتی ہے۔ اور تمہاری اس پاکیزہ مورتی کو جو ہمارے فردوس تخئیل میں پناہ گزیں ہے۔ شاید دھچکہ لگتا ہے"

کسی قدر اطمینان کے ساتھ جواب دیا گیا تھا:۔

"میں بھی کہوں کہ کیا بات ہے۔ تو یہ لپ اسٹک اور کیوٹکس تمہارا تحول اڑاتے ہیں لیکن یہ تو بتاؤ تم آخر آدمی ہو یا کوئی فرشتہ؟"

عرض کیا تھا:۔ "دراصل میرا دماغ عجز کچھ عالی ہے۔ مجھے یوں کچھ تکلیف نہیں لیکن دیکھتا ہوں یہ سرخی عام طور سے ایک مختصر سی آرائش ہے جو ناخنوں۔ ہونٹوں۔ اور رخساروں کی ہم نشینی سے لطافت اور جاذبیت پیدا کرتی ہے اور ماورا اسکے لطافت اور جاذبیت جیسے بذات خود کوئی شے نہیں۔ لیکن تکلیف ہوتی ہے سمجھنے میں کہ جنہیں یہ قدرت نے خود ہی قدرتی حسن سے آراستہ کیا ہے ان کے حق میں آرائش کا اہتمام کیسا؟۔ میرے خیال میں یہ ایک احساس کمتری ہے جس کو مٹانے کے لئے یہ ساری ملمع سازی ہے

لیکن وہ نقص کیا ہے اور اس کا اخفا کیوں؟ ہمیں سخت
دقت ہوتی ہے کہ تصنع کے پردوں میں تمہیں کہاں کہاں
ڈھونڈیں"

جواب دیا گیا تھا:- "بائی گاڈ۔ تم صنم پرست ہو۔ اور تمہاری یہ بھی ایک
غلطی ہے کہ تم تصنع سے مصنع اور پھر سیدھے صناع کو
کیوں نہیں ڈھونڈتے۔ جرأت ہو تو اس "کامن سنس"
کی دنیا میں عقل کے ذریعے اب تم صناع اور مصنع دونوں
کو خود ہی ڈھونڈ نکالو۔ اور تم سوچتے کیوں نہیں کہ تم نے
خود ہی کچھ آستین میں چھپا رکھا ہے اور ہمیں مورد الزام
ٹھہراتے ہو!"

۴

عفت کی دنیا۔

کینۂ انسانی کا آغاز و افتتاح لاتہذیبی کے ایک دور میں ہوا تھا۔ اس وقت جو یہ حادثہ رونما ہوا تھا تو وہ محض ضرورت کی تحت ہوا تھا۔ اور وہ ضرورت محض آگے چلکر رفتہ رفتہ تعقل کا جامہ پہنتی گئی۔ اور امتداد زمانہ سے اس تعقل محض نے ٹھوس اور مستقل علوم کی صورت اختیار کر لی۔ آج یہ علوم صورت حال کی تنقیص کرتے ہیں۔ جس وقت کینۂ انسانی کا افتتاح ہوا تھا وہ علی العموم مردانہ اقتدار اور تسلط کے زیر نگیں ہوا تھا۔ لیکن تجربات اور علوم کی اس فراوانی کے دور میں آج بھی اس پر یکطرفہ مردانہ اقتدار اور تسلط کا دباؤ اس جارحیت سے جلوہ گر ہے کہ آج کی سوسائٹی سے صحیح نسوانی کیرکٹر میدان سے گریز کرتا نظر آتا ہے۔ اور نسوانیت مفتوح و محکوم نظر آتی ہے، اس جارحیت نے اس کے کیرکٹر کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے اور اس وقت آزاد سے آزاد سوسائٹی میں

نہایت واضح طور پر اس کی درجہ بندی کی جا سکتی ہے۔ آج تہذیب کی دنیا میں ایک وہ نسوانی کردار ہے جو تکلف پسند ہے اور "پوز" اور نمائش اور زیبائش کی خوگر ہے۔ اور عادتاً خود نمائی اور جلوہ فروشی پر مجبور ہے۔ یہ کردار اپنی ساری سنگینی اور "ٹاسیلن" کے باوجود کم ہی راست کردار اور مخلص ہوتا ہے۔ یہ سوسائٹی کے مردانہ اقتدار کی مفتوح ترین قسم ہے۔ پھر ایک دوسرا نسوانی کردار ہے جو سراپا تسلیم ہے۔ وہ اپنی نسوانیت محض پر قانع و صابر ہے اور دوسرا پہلو انیاز ہونے کی وجہ سے مجوب ہے اور اس بنا پر معتوب بھی ہے، وہ اپنے اصول کے مطابق نقاہت اور نزاکت کی ڈھال پر اپنی نسوانیت کی مدافعت کرنے کی خوگر ہے۔ یہ کردار اس اقتدار اعلیٰ کی صحیح پیداوار ہے، یہ اس کا محکوم بھی ہے اور مفتوح بھی۔ پھر ایک تیسرا کردار ہے جو سادگی مجسم ہے جو تصنع اور اور نمائش کا قائل نہیں۔ یہ اپنے کو سدا نمائش کے موقف پر اسلئے نہیں رکھ سکتا کہ وہ طبعاً اس کا مجاز نہیں یہ کردار اس اقتدار اعلیٰ کا محکوم ہے لیکن مفتوح نہیں۔ لیکن آج یہ سارے کردار ایک ایسے کردار کے لئے میدان ہموار کر چکے ہیں جو اب کسی کی جارحیت تسلیم کرنے کا روادار نہیں۔ یہی ایک کردار ہے جو سوسائٹی کا صحیح توازن قائم کر سکتا ہے اور اس نام نہاد ترکہ جارحیت کی بیخ کنی کر سکتا ہے جو ایام جاہلیت سے نسل در نسل بے مزاحمت چلا آتا ہے۔ آج مشرق و مغرب کی سرزمین سے انقلاب کا نعرہ بلند ہے اور نسوانیت کا فرشتہ نوحہ زن ہے:-

"اے انقلاب کیا موہنی تیری صورت ہے اور کیا کامنی تیری مورت

ہے اور کسقدر دلفریب تیری رفتار ہے۔ یہ انداز معشوقانہ یہ عشوۂ دلبرانہ۔ یہ لازوال حسن یہ لافانی نزاکت! ــ اے سراسر کبک دری کی چال تو نے کہاں سے سیکھی ہے؟ لیکن خیر سے تو اتنا تو بتا دے کہ تو ابتک کس غارِ عمیق میں چھپکر سو رہا تھا۔ زمانے پر زمانے گذرے صدیوں پر صدیاں بیتیں اور وقت کی دبیز اور موٹی تہیں ہمارے اوپر پے در پے جمیں، خواب غفلت کے پردوں میں ہم پر محکومی اور مظلومی کا ایک گراں دور گذر گیا، ہم صدیوں تک پریم بنسری کی دلفریب اور جھوٹی تانوں پر رقص کرتے رہے۔ ہم عالم نسیاں میں عشرت پرستوں کی عشرتِ نگاہ اور نفس پرستوں کی نفس پرستی کی قربان گاہ پر بھیڑ بکروں کی طرح قربان چڑھتے رہے اور وقت کی ذرنی چکی میں گھن کی طرح پستے رہے۔ نہ پوچھو ہم نے کتنے مظالم سہے ہیں اور کتنی ہی ناروا اور ناجائز باتوں پر سر تسلیم خم کیا ہے، یہ ڈھونگ جو سماج کہلاتا ہے کسقدر ظالم اور کینہ پرور ہے، اس نے ہمیں اپنے مکر کے پھندوں میں صدیوں جکڑ رکھا اور ہماری آبرو ریزی کی، ہمارے ناموس کی دھجی اڑائی اور ہماری عفت کی مٹی پلید کی، لیکن اے سماج کے کٹھور اور سنگدل پجاریو، تمہاری یہ تاب و تواں کب تک؟

وہ دیکھو دورِ افق سے ظلمت کی گھٹائیں چھٹ رہی ہیں اور امید کی شعاعیں پھوٹ رہی ہیں، کچھ تیز تیز صدائیں کانوں

کے پردوں سے ٹکرا رہی ہیں۔ یہ بانگ جرس کی تیز اور پُر آشوب صدائیں ہیں۔ اب غفلت کا وقت کہاں۔ ہمارا قافلہ خود روانہ ہوتا ہے۔ آج ہم نے ہر اس بندھن کو توڑ دیا ہے جو ہمیں زندگی کی دوڑ میں پابہ زنجیر کئے ہوئے تھے۔ آج ہم نے بغاوت کا پرچم لہرایا ہے اور آزادی کا علم بلند کیا ہے، آج ہمارا سینہ رازِ نہانی کا وہ کھولتا ہوا آتش فشاں ہے جس کا دھانہ پھٹ چکا ہے۔ اس کے آتشیں لاوے تمہارے مکر و فریب کی بستیوں کو جلا کر خاکستر کر ڈالیں گے!۔

عشرت پرستو! تن آسانو! فلاکت کے مارو! تم نے ہماری مٹی پلید کی، لیکن اپنی بھی کیا صورت بنالی اور اس ارض پاک کی کیا صورت بنادی۔ تم کہاں ہو۔ وقت کی رفتار کے مخالف چلنے والے گمراہو! عشرت نگاہ کے جھوٹے پرستارو! کان کھول کر سن لو۔ اب ہم تمہیں ٹھوکروں سے راستہ چلنا سکھائیں گے، تم نے ہمیں بے بس پنچھی کی طرح اپنی حویلیوں میں محلوں میں اور گوشۂ حرم میں مقید رکھا۔ وہ تو کہو تم زندگی کے میدان سے بھاگ نکلے تھے۔ اور اپنے گوشہ حرم میں چھپ کر صدیوں تلک ہمیں ایک رنگین کھلونہ بنا کر کھیلتے رہے۔ اور وہ تو کہو تم نے ہمیں مفتوح کیا کہ خود ہی دنیا میں مفتوح ہوئے، لیکن اب ہم تمہیں وہ فرسودہ کھیل کھیلنے نہیں دیں گے۔ آج ہماری آنکھوں سے وہ دبیز اور

موٹے پردے اٹھ چکے ہیں اور ہماری نگاہوں نے فطرت کے سربستہ حقائق اپنی آنکھوں سے دیکھ لئے ہیں۔ اور ہمارے کانوں نے ان ازلی صداؤں کو سن لیا ہے جو خلا و ملا میں گونجتی ہیں۔ اب تم ہرگز ان حقائقِ ازلی کو ہماری نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رکھ سکتے" فطرت نے ہمیں بصیرت عطا کر دی ہے ہم تمہاری طرح قلب و جگر رکھتے ہیں۔ عقل و دانش، فہم و فراست اور درک و قیاس رکھتے ہیں۔ آؤ ہماری اور تمہاری ٹکر اگر لمبارڈی کے سبزہ زاروں میں نہیں۔ ٹرافلگر یا نیل کے دھانے میں نہیں، یا پانی پت یا پلاسی کے میدانوں میں نہیں تو زندگی کے اس میدان میں ضرور ہے جہاں ہم عقل، فہم فراست اور عمل کے ہتھیاروں سے لیس تم سے نبرد آزمائی کر سکتے ہیں۔

ہماری پکار مادر گیتی کی دختروں کی دردناک صدا ہے جس میں صدائے جبرئیل کی سی ہلاکت سامانی اور ایٹمی توانائی کی سی حشر آفرینی بدرجۂ اتم موجود ہے جو تمہارے شہرستان کو زیروزبر کرنے کے لئے کافی ہے۔ گو تمہارے لئے بظاہر سخت دل شکن اور مایوس کن یہ نظارہ ہے اور سخت بھیانک اس کے منشور ہیں اور سخت ڈراونا اس کا پروگرام ہے لیکن حق یہ ہے کہ کسی کی فطری آزادی کیوں سلب کی جائے اور کسی کا حقِ خود ارادیت کیوں چھین لیا جائے اور کسی کو کج فہم اور سہو نسیان کا پتلا قرار دے کر

اس کی فطری آزادی اور قدرتی بے ساختہ پن پر غاصبانہ حملہ کردیا جائے اور اسے دائمی طور پر مفتوح و محکوم بنا لیا جائے۔

خدارا انصاف! کس برتے پر تتاپانی۔ کیا آپ سیرت کے اس عروج کو پہونچ چکے ہیں اور پہاڑ کی اس بلندی پر چڑھ چکے ہیں جہاں آپ پر معترضوں کے تیروں کی بوچھاڑ نہیں پہونچ سکتی ہے۔ اگر نہیں تو لامحالہ ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ آپ اپنی سیرت کے اس کھنڈر میں خوش اور آباد رہیے اور ہم بھی اپنی اس مصنوعی دنیا میں خوش جسے ایک دن بنانے میں ہم ضرور کامیاب ہوں گے اور کسی دور مار راکٹ کے ذریعہ آپ کے نظام شمسی، نجمی، کہکشانی اور سحابی سے پرے خلائے بسیط کے کسی نہ کسی مدار پر ڈالنے میں ضرور کامیاب ہوں گے۔

آپ مانئے ہم فطرت کے پیہم تقاضوں سے مجبور ہیں اور وقت کی گردش سے لاچار ہیں۔ ورآنحالیکہ ایک عظیم طاقت۔ وقت کے دست کارفرما نے ہمارے دامن کو سختی سے پکڑ لیا ہے۔ اور ہمیں کھینچ کر زمانے کی دوڑ میں شریک کردیا ہے۔ اب ہم تمہیں یہ کیسے سمجھائیں کہ وہ دن نہ رہے اور وہ راتیں نہ رہیں اور برعکس اس کے ہم میدان عمل میں اپنی جدتِ طبع، جوہر ذاتی اور فطری اپج دکھانے پر مجبور ہیں۔ چہ جائیکہ سخت خطرہ درپیش ہے کہ ہم نے اگر کچھ پس و پیش کیا یا تھوڑی سی کوتاہی کی تو لامحالہ ہم اور ہمارے ساتھ

آپ بھی اس دوڑ میں کچل کر رکھ دیئے جائیں گے۔

للّٰہ تم اپنے دھرم کتھاؤں کی تانیں بند کرو۔ ان پرانے فرسودہ اور زنگ خوردہ سازوں کو نہ چھیڑو۔ ان کی رنگینیوں میں بدلتے ہوئے وقت کا وہ بے ساختہ پن کہاں اور وہ تڑپ کہاں؟ تمہاری پرانی ڈفلی کی ایک ایک دھاک ہمارے بڑھتے ہوئے قدموں کو آگے کے بجائے پیچھے کی طرف کھینچتی ہے!

خدارا زندگی کو نئے زاویئے سے دیکھو اور مذاق زندگی میں کچھ جدّت پیدا کرو اور زندگی کے تھمے ہوئے چھکڑے کو آگے بڑھانے کی کوشش کرو۔ وہ دیکھو ایک ان دیکھی عظیم طاقت تمہاری مدد کے لئے بے تاب ہے۔ کیا قیامت ہے تم نے آنکھوں کے ساتھ ساتھ اب تو کانوں کو بھی بند کر لیا۔ ورنہ یوں حرماں نصیبی پستی ناداری اور بیماری کے عالم میں نہ جانے کتنے سانبے روحانی آزاروں میں جتنی صبر آزمائیاں اور جاں کاہیاں تمہیں درپیش ہیں بخدا نپولین اعظم کو اس کی تین سو جنگی مہموں میں اور پندرہ برس تک جزیرہ سینٹ ہلینا میں مقید رہنے میں پیش نہیں آئی ہیں۔ وہ دور گیا۔ وہ روحانیت کی اوس بھی بھیگا بھیگا زن پرستی کا مقدس حسن موہک دلفریب اور سہانا سہانا سُست زمانہ گیا۔ مذہب کے لبادے میں لپٹی ہوئی تیموری دور کی ڈھیلی ڈھیلی ناز آفرینیاں گئیں۔ وہ اودھ کی شامیں گئیں اور دلی کی سہانی سہانی راتیں گئیں، اب

ڈھیلے کھڑے پیچھے کی طرف کیا تکتے ہو۔ منہ بسور کر ان محفلوں کو کیا روتے ہو۔ اُن کو وقت کی رفتار نے بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے اور وہ قدامت اور لاتہذیبی کی گرد میں دفن ہو چکی ہیں۔ کیا تم وقت کے اسی تیز رفتار راکٹ سے چھلانگ لگا کر گذری ہوئی منزلوں کی طرف لوٹ جانا چاہتے ہو۔ خبردار! ــــ اور ذرا سنو۔ کچھ شائستگی اور تہذیب سیکھو! ۔ ہمیں حرم، بیویاں یا دیویاں نہ کہو، کیونکہ درحقیقت ہم وہ نہیں۔ بخدا ہم تمہاری طرح انسان ہیں اور تمہاری برادری میں برابر کا درجہ رکھتے ہیں۔

بخدا ہمیں دور ہیں وہ پرانے نوک جھونک اور وہ فرسودہ ٹھٹے مخول اب ایک آنکھ نہیں بھاتے، اب تو ڈھول دھپا چھیڑ چھاڑ کے تصور سے بھی جی گھبراتا ہے۔ اب تو سدا دل یہی چاہتا ہے کہ ہماری اس نسوانی دنیا کی تعمیر جلد از جلد مکمل ہو اور اسے کسی برج پر جگہ مل جائے اور وہ جلد گردش کرنے لگے تاکہ اس کی جدید روشنی میں خلائے بسیط بقعۂ نور بن جائے۔

زمانۂ لامحدود سے ان گنت صدیوں تک ہم نے تمہارے آباد کھنڈروں میں تپسیائیں کی ہیں۔ ایک لامحدود زمانے تک تمہارے کنج حرم کی ڈراؤنی تاریکیوں میں چلہ کشی کی ہے، اس دوران میں ہم نے افکار و نظر کے بڑے بڑے پہاڑ ڈھائے ہیں اور تخیل کے کتنے ہی دقیق اور عمیق سمندروں میں غوطے لگائے ہیں

بار ہا ہم نے صدق دل اور صفائی نیت کے ساتھ پاکیزگی عفت تقدس اور نفس کی سنگینی کے کتنے ہی اسکیم اور منصوبے تیار کئے اور ان کو کامیاب بنانے کے لئے لاکھ جتن کئے لیکن توبہ ہے تم سے اور تمہارے تلون آشنا مزاج سے کہ تم نے انہیں سدرۃ المنتہا سے گرا کر تحت الثریٰ میں ڈال دیا، آخر تم عفت تقدس اور پاکیزگی کا نام ہی کیوں لو جبکہ تم اس کی اصطلاح تک کو نہ سمجھو! اب ہم نے ضرب کلیمی کی ان ٹھوس اصطلاحوں کی روشنی میں ایک لائحہ عمل مرتب کیا ہے اور ہم حسن و خوبی کے ناطے بطور اقدام پیشین کے تمہیں دعوت فکر و نظر دیتے ہیں کہ مبادا نیل کی غرقابی کا وہ سانحۂ عظیم تم نہ دھرا بیٹھو!

زمانہ آزادی کی قسم! شرافت اور ماڈرنٹی کے اس دور میں ہم نے اسی ازلی حسن کی جھلک دیکھی ہے جس کی تنویر بدلتے ہوئے وقت کے شیشے سے تقدس کا ایک نیا زاویہ اور ایک نیا سماں پیش کر رہی ہے جس کی کیفیت میں ہم مست الست ہیں اور جس کے نشے میں ہم چور چور ہیں۔ وہ کیفِ ازلی کسی کی آبائی ملکیت نہیں۔ وہ زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہے۔ آزادہ منشی اور آزادہ خیالی کے اس دور میں یہ کسقدر نازیبا ہے کہ آپ اپنے خیالات ہم پر لادے جا رہے ہیں۔ حالانکہ آپ کے خیالات کے وہ فرسودہ چھکڑے اب ہم سے کھینچے نہیں جاتے، خدارا اس

جاں بلب تقدس کو اور اس دم توڑتی روحانیت کو ندامت کے زنداں سے آزاد کرو اور اسے تہذیب کا چھینٹا دیکر معاشرت کی وادیوں کی سیر کراؤ۔ ورنہ اگر قیامت تک اس ممی کئے ہوئے تقدس کے مردار کو اپنے کاندھوں پر اٹھاتے پھرو گے تو بھی تمہیں نفس کی سنگینی حاصل نہیں ہو گی۔"

۵

مظاہرۂ حسن:-

جنگ ختم ہو چکی تھی۔ وہ جنگ جو چھ سال کی طویل مدت تک سخت جاں نشانی کے ساتھ لڑی گئی تھی ایک دن ۲ر ستمبر ۱۹۴۵ء کو بڑی آسانی سے ختم ہو گئی تھی۔ بات سخت مضحکہ خیز نظر آتی تھی۔ کیونکہ ہم جو اس جنگ میں حصہ لے رہے تھے ابتک یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ ہم آخر لڑکیوں سے تھے اور لڑ کس سے رہے تھے۔ انگریز اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے کہ ہم ہٹلر اور مسولینی سے لڑ رہے تھے۔ لیکن ہم ہٹلر اور مسولینی سے کبھی نہیں لڑے تھے۔ ہم لڑتے تھے تاریخ ساز فریڈرک، بسمارک اور رومتہ الکبریٰ کے تہذیب کے اثاثہ سے۔ ہم لڑتے تھے مکانات اور تعمیرات سے۔ ہم لڑتے تھے حشرت الارض سے۔ نباتات جمادات سے، ہواؤں سے اور فضاؤں سے۔ برف و باراں آندھی اور طوفاں سے اور سطح زمین سے۔ کسقدر مضحکہ خیز بات بنی تھی اور سخت

لیتمائی کا مقام تھا کہ جنگ کے فلسفی بھی کیا بصیرت رکھتے تھے کہ ان کے
ہم پرست جنہوں نے اپنے جسم کو صحت کی خاطر جوکھوں میں نہیں ڈالا
تھا، صحیح طور پر نہیں بتا سکتے تھے کہ آخر اس غارت گری اور چنگیزی کی غایت
کیا تھی۔ کیا یہ جاں ستانی اور جاں کنی شجاعت کی خاطر تھی یا سوداگری اور
مستعمرات کی خاطر یا ناموس انسانی کو بیچ کھانے کی خاطر! — اور وہ
شجاعانہ، سفاکانہ، اور سوداگرانہ ذہنیت جواب جدل کی سرحد پر بنتیرے
بازی میں عافیت سمجھتی ہے، در اصل شجاعت اور جدلیات کے فن سے
کوئی دلچسپی نہیں رکھتی ہے، کیونکہ سورماؤں کی شجاعت سفاکی اور آدم
فروشی مسلم ہے، اور تاریخ اعلان کرتی ہے کہ نہ تو اس قدر شجاعت کی
ضرورت ہے نہ اتنی سفاکی کی اور نہ اس بے مہار سوداگری کی جو ناموس
انسانیت کو بیچ کھاتی ہے۔

جنگ ختم ہو گئی تھی اور ہم نے اٹلی کی جنت نشاں سرزمین کو سلام
عقیدت پیش کیا تھا۔ اور اس بلاد مرحوم سے دست بستہ معافی کے خواستگار
ہوئے تھے کہ خطا لائق ہمارے تھی اور معافی لائق تمہارے ہے کہ تم ہماری
خطاؤں سے درگذر کرو اور ہمیں تہ دل سے معاف کردو۔ اور ہم نے ہم پرستی
کی روح کو لعنت بھیجی تھی۔ اور اس سرزمین کو ہم نے پرحسرت نگاہوں سے
الوداع کیا تھا۔ لیکن اپنے وطن کو لوٹنے سے پیشتر ہمیں اپنے گناہوں کی
تلافی کرنی پڑی تھی۔ یعنی کہ ہمیں مزید مرحلہ پیمائی کرنی پڑی تھی، ہماز ہمیں قدموں سے
ہم مصر کی سرزمین میں داخل ہوئے تھے کہ ہمارے لوٹتے ہوئے قافلے کا عنان کس قدر

تکلف کے ساتھ موڑ دیا گیا تھا اور ہمیں یونان کی سرزمین پہ وارد کیا گیا تھا اور دیدہ و دل فرشِ راہ اس سرزمین نے ہمارا پرتپاک خیر مقدم کیا تھا۔ وہاں ہم وارد ہوئے تھے خالص تعمیری عوامل کے لئے لیکن ان تعمیری عوامل سے ہم کسقدر فائز المرام ہو سکے ہیں وہ تاریخ میں درج ہے۔ چنانچہ ہم یونان کی تقدس نشان سرزمین پہ وارد ہوئے تھے، ہماری نگاہوں کے آگے اس کی دیرینہ سطوت اور عظمت کا نقشہ بکھر گیا تھا۔ اس کی دیرینہ عظمت کے نشان "مراتھن" اور "سلامی" ذہن کے پردے پہ ابھر رہے تھے۔ اور تخیل کے پردوں پہ "تھرمالپی" کی شہادت گاہ کے دلدوز نظاروں میں گویا جان پڑ گئی تھی اور وہ نگاہوں کے آگے رقص کرنے لگے تھے۔ اور عقیدت کا جذبہ موجزن تھا کہ زہے قسمت یہ وہی سرزمین ہے جس نے ارسطو، سقراط، افلاطون اور ہومر جیسے باکمال ماہر فن فضلاء و حکماء کو جنم دیا تھا جن کی حکمت اور فن کی رہتی دنیا ممنون رہیگی۔ اس کی فضاؤں میں بلبلِ یونان حسن و عشق کی پیکر "سافوس" کے زندۂ جاوید نغموں کے ترانے اب بھی گونجتے ہیں۔ اور اس کے صدق و سوز کی شاہد عادل "لوکاڈیا" کی سربر آوردہ چٹان اب بھی استادہ ہے جس کی بلندی سے وہ جست لگا کر واصل بحق ہوئی تھی اور اس کی روح اب بھی وہاں منڈلا رہی ہے اور للکار رہی ہے۔ اے مدعی خبردار یہ عشق کی آخری سرحد ہے۔ جب ہم اس تقدس نشان سرزمین پہ وارد ہوئے تھے تو دل لرز گیا تھا۔ وہ سرزمین اپنی زندۂ جاوید یادگاروں اور اپنی سطوت اور شوکت کے آثار مقدسہ کو اپنے سینے سے لگائے زبان حال سے ماتم کر رہی تھی کہ اب وہ

مراتھن اور سلامی کہاں؟ ۔تھرماپلی کی شہادت گاہ میں وہ تاثر انگیزی کہاں ۔لوکاڈیا کی بلندی پر پھیر وہ غازیانِ صدق و سوز کہاں؟ ارسطو اور افلاطون کہاں؟ اعجاز بیاں سے خوں کو گرما دینے والا ہومر کہاں؟ اور فن اور حکمت کے نام لیوا کہاں؟ اور دل خون ہوگیا تھا کہ یہ بیدرد زمانہ بڑی بڑی قوموں کے کارناموں پر کسقدر جلد پانی پھیر دیتا ہے۔ اور اسنے کس بیدردی سے اس عظیم قوم کو، گوشۂ عافیت میں بٹھا دیا ہے۔ اور وہ زمانے کا سرد و گرم کس بے دلی سے برداشت کرتی جاتی ہے۔ لیکن ایک مبہم سی امید کا ایک سہارا تھا کہ یہ ازل کا قافلہ بیشتر منازل طے کرتا ہوا رکا ہے اور دم لیکر ضرور آگے بڑھے گا۔ درانحالیکہ ارسطو، افلاطون، دیمقراطیس، فیثاغورث، اور پرمینیدس کی بصیرت اور فن کی عظمت اب بھی شعلہ زن ہے، مراتھن سلامی اور تھرماپلی کی شہادت گاہوں میں جو آگ دبی ہے وہ اسے آتش بداماں کرنے کے لئے کافی ہے۔ لیکن وہ آگ آج جست کیوں نہیں لگاتی۔ اور سورماؤں کے دامن جلاکر خاکستر کیوں نہیں کر ڈالتی — لیکن زمانہ اس سہانے دور سے آگے نکل چکا ہے اور امتداد زمانہ سے آج انسان آگ کا متلاشی نہیں وہ برق کا جویا ہے۔ وہی برق جو اسکے آب و گل میں جاری و ساری ہے اور وہ ابتک نہیں جانتا ہے کہ وہ برق اسکے کس کام آسکتی ہے۔

یونان کی برفستانی ہواؤں میں مہکی مہکی فضاؤں میں، لہراتے بل کھاتے اور اڈتے ہوئے رنگین جلوؤں کی اس طغیانی میں، حسن اور دلفریبی حسن کے اس طوفان میں، برہنہ اور بے محابا تجلیوں کے اس ہیجان میں، تہذیب

شائستگی، خود آرائی اور مظاہرہ حسن کی اس اندھی اور جھکڑ میں جہاں کوچے کوچے سے گل دگلزار کی سی بھینی بھینی خوشبوؤں کے جھونکے چلتے ہوں اور چپے چپے سے ایوننگ پیرس کی لپیٹیں اٹھتی ہوں ایک دم سے ایک سادہ پرکاری کہاں سے ٹپک پڑی تھی۔ وہ سادہ پرکاری دراصل ایک حسن مجسم کے قدو قامت اور خدوخال میں نظر آئی تھی۔ تجسمہ سے ڈرتے تھے اور سادگی کو مجرد دیکھنے کی تمنا دامنگیر تھی۔ آنکھوں کو یقین اور دل کو اعتبار نہیں تھا اور حیرت کی بات بھی نہیں تھی۔ درانحالیکہ وہ ملک وقوم کے شاندار مستقبل کا ایک درخشاں ستارہ تھی جس کی تابانی اپنے اندر اپنی ہی کیفیت لئے ہوئے تھی۔ ایک مغربی دوشیزہ نہیں ایک مغربی "حور" مشرقی طرز وانداز میں ڈوبی ہوئی، تقدس کا ایک کیف نگاہوں میں بسائے ہوئے۔ ایک روشن سا دل پہلو میں لئے ہوئے، عفت کی ایک دنیا دامن میں سمیٹے ہوئے۔ تصنع سے کوسوں دور رخسارے انگارہ نور جبیں انوار یزدانی سے معمور، چہرہ درخشاں، لب خنداں، انفاس پاکیزہ، عادات برگزیدہ، اخلاق دلپسند، خیالات بلند، جذبات دہ چند۔ اور ایک تجاہل عارفانہ بہ سرزد ہوا تھا کہ وہ ایک دن چپکے سے نسیم سحر کے ایک ہلکے جھونکے کی طرح بے ساختہ ہماری زندگی میں در آئی تھی جس میں خود اپنی گنجائش بہ مشکل نظر آتی تھی۔ اس کا کہیں وہم وگمان تک نہیں تھا۔ لیکن بعد ازاں اس نے حواس کی دنیا کو متزلزل کرنا شروع کر دیا تھا تو اپنے احوال کا صحیح کشف ہوا تھا۔ اس کا ذکر کیا حالت اپنی یہ ہوئی تھی کہ بسا اوقات کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گویا ایک سنگین سی شے دل کے آہنی دروازوں کو مسمار کرتی ہوئی اس کی عمیق ترین گہرائیوں میں

اتر تی جارہی ہے اور ہم اسے اول اول اپنی متلون طبیعت کی کرشمہ سازی سمجھ رہے تھے۔ دل میں ایک خلش اور جگر میں ایک سوزش محسوس ہوئی تھی، دل کی حالت تو ایک طرف ابھی یہ حالت ہوئی تھی کہ اپنے پاؤں تلے کی زمین بتدریج نکلتی جارہی تھی لیکن اپنے زعم میں اپنے ہی کو گرم سیر سمجھ رہے تھے المختصر اینکہ ہم نے عالم تخیل میں گویا بیہوشی یا مراقبے کی حالت میں دیکھا تھا کہ ہم زندگی کے ایک لق ودق میدان میں سفر کر رہے تھے کہ ناگاہ حسن کے کسی فرشتے نے ہماری راہ میں حسن کا ایک پر بہار گلشن حائل کر دیا تھا۔ جس کی رعنائی رنگینی اور دلفریبی کوثر و سلسبیل اور روز جزا اور یوم قیامت کا حکم رکھتی تھی۔ اس کی دلفریب اور خاردار جھاڑیوں میں ہمارے دامن الجھنے لگے تھے، قدموں کی لغزشیں ہوئی تھیں۔ ارادے متزلزل ہوئے تھے اور ہم ڈگمگائے تھے اور گراہی چاہتے تھے کہ کسی نے نزاکت اور نقاہت کے عالم میں بڑھ کر ہمارا دامن تھام لیا تھا اور اپنا پھولوں سے زیادہ رنگین اور نازک سہارا پیش کیا تھا۔ اور ہم غور کر رہے تھے "نزاکت" پر کہ عمل خر ثقیل کا ہے جس سے یہ کیونکر عہدہ برآ ہو سکتی ہے۔ اشارات عیاں تھے۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا یعنی کہ خود ہی کوشش کریں اور کسی طرح سنبھل جائیں۔ لیکن نگاہوں سے نگاہیں ٹکرائی تھیں اور عقل نے ہتھیار ڈال دی تھی۔ عقل نے دل کو "دل سے ملنے" کے جواز پیش کئے تھے لیکن دل نے کہہ دیا تھا!

"عقل ایک میزان ہے جو صرف تولنا جانتی ہے پرکھنا نہیں جانتی۔ محبت سراسر ایک مست اور رنگین جذبہ ہے۔ یہ ایک نشہ ہے جس میں افیون کی سی سرمستی، غفلت،

یہ موت ہی اور موت ہے اور تیرے فرائض ازلی کی انجام دہی میں مخل ہوگا۔ لہٰذا اس موذی سے ذہنی تحفظ لازم ہے"

اور حسن کے فرشتے نے چھوٹتے ہی جواب دیا تھا۔

غلط! عشق ایک جذبۂ شہادت ہے جو مدعی کے سر پر کفن باندھ کر اسے رزمگاہ خیر و شر میں جھونک دیتا ہے یہی اصل زندگی ہے اور یہی اصل سیرت ہے"

اور ہم شہادت پر غور کر رہے تھے کہ مزید محکم دلائل پیش کئے گئے تھے۔

"عورت فطرت کی ایک دلکش اور دلنواز تخلیق ہے۔ اس کی قدر شناسی اقتضائے بشریت ہے۔ اس کی خوشنودی کے بغیر انسان خواہ کتنا ہی بلند ہو زندگی کے حقیقی تصور سے محروم رہ جاتا ہے۔ اور "طاقت غیبی" کو حرکت میں لانے کے لئے اس کے آستانے کی حرارت سے آتش بداماں ہونا ضروری ہے ورنہ زندگی کی ہر تڑپ خام اور ہر "عشق" کمزور ہے"

ہم نے بھی دلائل اور براہین کا سہارا لیا تھا۔

"ہر عشق کمزور نہیں ہو سکتا ہے۔ حسن و لطافت کی پیکر عورت ایک فتنۂ مجسم ہے۔ حسن کے تین حروف اور تینوں کے تینوں ٹیڑھے۔ یہ حسن ایشیا والوں کے لئے ایک قیامت صغرا ہی ثابت ہوا۔ اس کی بربادیاں

تباہ کاریاں اور ویرانیاں ۔ الامان والحفیظ! اس کی
ہلاکت سامانیوں کے آگے ایٹمی توانائی بھی سر بہ گریباں
ہے ۔ اس نے دلوں کی بستیوں کو اجاڑا قوموں کو تباہ و
برباد کیا اور ملکوں اور دیشوں کو ملیامیٹ کیا۔"

حسن کے فرشتے نے تنکر سوال کیا تھا ۔
"آپ کا وہ حسن ہے کون سی بلا ۔ کیا وہ کوئی مادی غیر
مادی، ذی رُوح یا غیر ذی روح شے ہے، کیا اس کے
مقدار وزن یا تول ہوتے ہیں ۔ کیا وہ کھانے پینے یا اوڑھنے
بچھانے کی کوئی چیز ہے؟"

ہم نے متامل ہو کر جواب دیا تھا ۔
"اوڑھنے بچھانے کی چیز کیا ۔ نگاہیں، قد، کچھ وضع اور چند
ادائیں اس کے کل اثاثہ ہیں جو محض اشکال و افعال طبیعی ہیں
ان کی ماہیتِ مطلق کا کسی کو بھی پتہ نہیں !"

حسن کے فرشتے نے متحیر ہو کر سوال کیا تھا " یہ کیا طرز گفتار ہے؟"
عرض کیا تھا ۔ " طرز گفتار غلط نہیں ۔ یہ سارے کسی تبر رگ تسمہ پا کی طرح
ناموس انسانیت کے دوش و گردن پر مسلط ہو جاتے
ہیں اور تہذیب انسانی کا گلہ گھونٹ دیتے ہیں ۔ یہ مقرر
ایک عذاب الہی ہیں اور خاصی سزا ہیں اولاد آدم کی !"
پھر فرشتۂ حسن نے میری زجر و توبیخ کی تھی ۔

"آپ کہاں سے بول رہے ہیں۔ آپ شاید کسی ایزی چیئر سے بول رہے ہیں یا کسی گدازنہ بستر پر سے عالم خواب میں بول رہے ہیں، آپ فرہاد کے تیشے سے پتھر کی چٹانوں کو ریزہ ریزہ کرتے ہوئے ایران کے کسی پہاڑ سے نہیں بول رہے ہیں۔ یا ہمالیہ کی چوٹی کا پتہ لگاتے ہوئے کن چن جنگا یا ایورسٹ سے نہیں بول رہے ہیں۔ یا قطب جنوبی کا پتہ لگاتے ہوئے ہزار میل کی پا پیادہ برفانی سفر کے بعد قطب کے سنسان پہاڑ سے نہیں بول رہے ہیں۔ یا چاند یا مریخ کے سفر میں نکلے ہوئے کسی راکٹ سے نہیں بول رہے ہیں کیونکہ وہاں اس سزا اور جزا کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ حسن اگر کھانے پینے یا اوڑھنے بچھانے کی چیز ہوتی تو فرہاد کوہ کنی نہ کرتا اور نہ ہی اپنے ہاتھوں سے سر پر تیشہ مار کر خود ہلاک ہوتا۔ اور نہ ملوری اور اروین ہمالیہ کی چوٹی پر جاتے اور برف کے فرشتے برفانی قبروں میں ان کی تجہیز و تکفین کرتے۔ اور نہ ایمنڈسن قطب جنوبی کا پتہ لگانے کے بعد قطب شمالی کے سفر میں نکل کر خود ہی لاپتہ ہو جاتا اور نہ عشرت کدہ ارضی کو چھوڑ کائناتی خلاؤں کی سیر کی سوجھتی اور آفات خلائی سے دوچار ہونے کے لئے کسی کائناتی راکٹ کی تکمیل کی جاتی۔"

ہم نے مبہوت ہو کر سوال کیا تھا۔

"پھر تو حسن کا تخیل ایک مطلق پہلو سے سر بسر عاری ہے!"

اطمینان سے جواب دیا گیا تھا۔

"حسن کا تخیل اور تاثر احوال و مقامات کا پابند ہے اور اس کا تخیل اور تاثر سراسر اضافی ہے۔ آپ مریخ کی نہروں پر یا چاند کے غاروں میں اس حماقت کے مطلق مرتکب نہ ہوں گے!"

پھر ساتھ ہی ساتھ تکمیل کلام کیا گیا تھا۔

"آپ جس حسن کی تلاش میں ہیں ضروری ہے کہ آپ اسکے منفی پہلو پر چل کر اس کی تلاش کریں کیونکہ ہر جستجو کا یہی صحیح پہلو ہے۔"

اور ہم نے فرطِ طرب میں جھوم کر کہہ دیا تھا۔

"لیکن اے جانِ جگر بات ذرا سہل اور صاف صاف ہو"

اور انہوں نے جبیں بہ جبیں ہو کر جواب دیا تھا۔

"جانِ جگر کیا خرافات ہے! دھیان سے سنو۔ دراصل دل دادگانِ حسن ساحلِ دریا پر بھی تشنہ لب ہوتے ہیں کیونکہ تشنہ لبی ہی جوہرِ زندگی ہے۔ اسی میں فرد اور ملت دونوں کی نجات ہے، ورنہ حسن ایک ایسا دریائے سحر ہے جہاں حیاتِ انسانی کا بیڑا پار کم لگتا ہے اور غرق زیادہ

ہوتا ہے۔ آج ایشیا کی آبادی جس تیزی سے بڑھتی جارہی ہے۔ افزائش نسل جسقدر لاینحل بنتی جارہی ہے۔ تعداد جس تیزی سے بڑھتی جارہی ہے۔ استعداد یا "کوالٹی" جس تیزی سے گھٹتی جارہی ہے اور نسل انسانی جس قدر کمزور و ناتواں ہوتی جارہی ہے کہ اگر حالت یہی رہی تو مستقبلِ قریب میں ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے جب نسلِ انسانی گر کر اپنے جد قدیم "بوزنا" سے جا ملے گی"

ہماری زبان سے بے ساختہ ایک چیخ نکل گئی تھی۔

"پھر تو حیاتِ انسانی کو ایک حادثۂ عظیم درپیش ہے لیکن اس کا علاج؟"

حسن کے فرشتے نے جواب دیا تھا۔

"کردگارِ فطرت نے جسے تخریبی صفات عطا کی ہے اسنے اسے ہی تعمیری صلاحیت ودیعت کی ہے، انتشاری رجحان مادیت کا خاصہ ہے۔ آپ اگر سعیٔ بلیغ کے ساتھ اس مہلک رجحان کا سدباب نہ کریں تو دنیا کی ہر شے فنا ہو جائے گی، آپ فطرت کے اس انتشاری رجحان کا ہر گاہ سدباب کر سکتے ہیں!"

پھر ہمنے سوال کیا تھا:۔ "زخم جگر اور عشق درقت کا کیا ماجرا ہے؟"

اس نے تبسم کی بجلی گراتے ہوئے جواب دیا تھا:۔

یہ زخمِ جگر خاک بھی نہیں ۔ یہ تمہاری بشریت کی کمزوری

ہے ۔ عشق درحقیقت دراصل ایک جذبہ شہادت ہے جہاں

محبوب کے سر سے بلا اختصار انکار کیا جا سکتا ہے ۔ اس لئے

کہ عالمِ عشق کا اصول نہیں کہ شاہد و شہود ایک دوسرے

کے درپے ہوں ؟"

ہم سخت حیران تھے اور اسوقت ڈرتے ڈرتے کچھ تامل کے بعد ہم نے کہہ دیا تھا ۔

"اے دلربا حسن کے فرشتے تو دراصل ایک مقدس

پھول ہے !"

اور اس کی زبان سے کسی قدر لکنت کے ساتھ نکلا تھا :۔

"لیکن تم بھونرا نہ بننا"

اور ہماری زبان سے بے ساختہ نکل گیا تھا ۔

"اے ناقہ لیلےٰ دو قدم راہ غلط کر

مجنوں زِ خود رفتہ کبھی راہ پر آوے"

"میں تمہارے لئے بلبل بنوں گا اور تمہاری حمد و ثنا میں

اپنی ہستی کو مٹا ڈالوں گا !"

اور اسنے ایک انداز بے تابی میں جواب دیا تھا ۔

"تم کتنے اچھے ہو ! لیکن تم میری حمد و ثنا میں اپنی ہستی

کو ہرگز نہ مٹانا ، تم جس حسن کے شیفتہ و فریفتہ ہو وہ

ایک سیمیا ہے جو تمہیں سدا سرگشتہ و برگشتہ رکھے گا

اور تمہارے لئے باعث ہلاکت ہوگا۔ جاؤ اس
حسن کی ایک حقیقی لو تمہیں حق و صداقت کی اس قربان
گاہ میں ملے گی، جہاں ہستی نیستی ہے اور نیستی ہستی ہے اور
جہاں زندگی اور موت میں کوئی فصل نہیں۔"

ہم نے ایک کرب ناگہانی کے عالم میں کہا تھا۔
"کہنے کی بات نہیں۔ تمہیں بھی اے سیمیائے مجسم اس جام
شہادت میں شرکت کرنی ہوگی کیونکہ ہستی اور نیستی کی
سرحد کی لکیر پر مجبور چلنے میں مجھے خوف دامنگیر ہے!"
اس فرشتۂ حسن نے اپنے "ازلی حسن" کی ایک لازوال حرارت میرے جگر میں پھونک
دی تھی:-

"تم نادان نہ بنو!۔ موت سے کیا ڈرنا در آنحالیکہ موت
ناگزیر ہے۔ اور ہر شخص کو مرنا ہے لیکن حق و صداقت
کی اس قربان گاہ میں تمہارے ذوق نظر کے صدقے
"ما قتلوہ" کا ازلی فرمان اب بھی جاری ہے۔ تم شاہد
ہو اور شہادت تمہارا شیوۂ ازلی ہے اور کتمانِ شہادت
تم پر حرام ہے"
ہم اس کے حضور سے رخصت ہو گئے تھے، زیر لب کہہ رہے تھے۔
؎ یہ حسن کی بستی رہے آباد تمہاری
دلچسپ بہت تم سے بھی ہے یاد تمہاری!

اور ادھر اس فرشتۂ حسن کے لبوں پر ایک غمگین سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

اس نے اعلان کیا تھا۔

"میری یاد دلچسپ ضرور ہے لیکن تم فرد بشر بھی کیا یاد کرو گے تمہیں جو سبق پڑھا دیا ہے تم اسے اب کبھی نہیں بھولو گے۔ میں جانتی ہوں تمہیں ایک دن میری بارگاہ میں لوٹنا پڑے گا۔ کیونکہ میرے پاس ایک ایسی قوت جاذبہ ہے جو تمہیں ہفت افلاک سے ڈھونڈ نکالے گی اگر تم خاک بھی ہو چکو تو میری مسیحائی تمہیں دوبارہ زندہ کرے گی اور اپنا آستانہ حسن پھر سے آباد کریگی!"

۶-

روحانی اتصال:-

اگر آئین اسٹائین کا عالم لاہوت کا نظریہ صحیح ہے اور افلاطون کی تھیوری درست ہے کہ ہر شئے کا تصور عالمِ لاہوت سے ماخوذ ہے تو باب ماسبق کے تمامتر واقعاتِ ذہنی میرے لئے بحیثیت ایک حادثے کے سرزد ہوئے تھے۔ درآنحالیکہ یہ نوع انسان کی روحانی اضطراب کی پیداوار تھے۔ حوادث ذہنی آغاز ہیں ان تمامتر حوادث کے جن پر فطرت نے سارے تاریخی حوادث کے ڈھانچے گڑھے ہیں۔ جسطرح آرٹسٹ کا شاہکار پہلے اس کے ذہن میں جنم لیتا ہے پھر بعد میں پردے پر نمودار ہوتا ہے۔ یا جسطرح سنگ تراش مجسمہ کو پہلے اپنے ذہن میں گڑھتا ہے پھر اسے پردۂ ذہن سے اتار کر اپنے آلات کی مدد سے مادیت کی شکل عطا کرتا ہے، ان عوامل میں ایک طاقتِ روحانی ہی کارفرما ہے جو اولاً ان کے تصور میں عمل پیرا ہے

اور آغاز سے انجام تک سارے عمل میں جاری و ساری ہے۔
ہم نے شیفتگی اور سرگشتگی کے عالم میں جو کچھ دیکھا تھا عالم مجاز میں اس کی تصدیق اس طرح ہوئی تھی کہ اس کرہ زمہریر میں سمندر کے ساحل پر ایک پر منظر پارک میں جس کے پس منظر میں سمندر کی بے تاب لہریں مچل رہی تھیں اور "سلور سینڈ" پیچ پر اکر پیچ و خم کھا رہی تھیں، آفتاب کی جان بخش شعاعیں رقص کر رہی تھیں اور رگ و پے میں زندگی کی حرارت نفوذ کر رہی تھیں۔ اس دوشیزۂ مجسم سادگی سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ یہ ایک اتفاق محض تھا کہ ہم راہ میں ملے تھے اور متصل پارک میں جا نکلے تھے۔ سمندر کی موجیں تڑپتی تھیں اور کف بلب گرجتی تھیں اور چیختی تھیں، اور کچھ اہم باتیں کہتی تھیں لیکن بے بضاعت انسان انہیں سمجھنے سے قاصر تھا۔ موجوں کی صدائیں انسان کی صدائیں، مرغ و ملخ کی صدائیں۔ آخر صدائیں ہی ہیں اور صداؤں کا سلسلۂ نسب ایک ہی ہے ۔ اپنی صداؤں کو ہم معنویت عطا کرتے ہیں۔ اور زبان کہتے ہیں۔ اور باقی صدائیں فقط صدائیں ہیں!۔ ہم اس فلسفہ کو ماننے کے لئے قطعی تیار نہیں تھے اور ہم نے اس دوشیزہ سے پوچھا تھا "یہ موجیں کیا کہتی ہیں؟" پہلے تو وہ متذبذب تھی پھر اس نے چھوٹتے ہی کہا تھا! "موجیں موسم کی ناسازگاری کے شکوے کرتی ہیں" پھر ہمیں بھی گفتگو کا ایک برجستہ موضوع مل گیا تھا۔ پھر تو موسم کی ناسازگاری اس کی سحر انگیزی اور انقلاب انگیزی پہ طویل بحث کی گئی تھی۔ گردش زمینی اور منطقات زمینی پر تبادلۂ خیال کیا گیا تھا، پھر آفتاب غروب ہوا چاہتا تھا اور اس سادہ دوشیزہ نے کنایتہً کہا تھا:۔

"یہ کچھ سیاہی جو ہماری زندگی کے ان لمحات پر مسلط
ہوا چاہتا ہے آج کسی قدر اختلاج آور نظر آتی ہے اور
نہ جانے مجھے کچھ خوف بھی کیوں دامنگیر ہے"

ہم نے خوف کا سبب نہیں پوچھا تھا کیونکہ ہم خود کسی خوف میں مبتلا ہونا نہیں
چاہتے تھے، چنانچہ ہم نے سہل جواب دیا تھا۔

"یہ سیاہی جسے ہم رات کہہ سکتے ہیں دراصل وقت
یا زمانہ ہی کی ایک کرشمہ سازی ہے جو ایک ہزار میل فی
گھنٹہ کی رفتار سے کبھی شب کے دامن میں ایک مہیب
سائے کی طرح اور کبھی دن کی متلاطم تجلیوں میں نور کی
لہروں کی طرح پیہم سرگرداں ہے اسطرح کہ گویا نور و
ظلمت ایک دوسرے کے تعاقب میں ہیں، اور ہمارے
ان لمحات میں زماں کے ساتھ ساتھ مکاں کا بھی ایک اہم
پہلو جڑا ہوا ہے۔ ہم صرف زماں کا ذکر نہیں کر سکتے
ہمارے لئے مکاں کا تذکرہ لازمی ہے ورنہ خالص
زماں کا تصور سیارہ نیپتون یا پلوٹو کے بھی اوقات
پر حاوی ہے، جہاں کے اوقات کے مطابق ہماری
اس ایک ساعت کی صحبت ایک صدی کے برابر
ہو سکتی ہے، حالانکہ یہ بات یا یہ توت کو پہونچ چکی ہو
تاہم اگر ہم یہ کہیں کہ ہم اور تم اس صحبت میں ایک

صدیٔ فسردہ کش تھے تو تمہیں ہنسی آئیگی "

اور افلاطون کے قول کی صداقت بالکل ہمارے حسب حال تھی کہ انسان کے سارے جواثی خاطی ہیں کہ اُس سادگی کے پیکر نے اپنی زندگی پر اور تصنع سے نفرت کے اسباب پر شعاع ریزی کی تھی تو ہمیں اس کے دلایل معقول ہوتے ہوئے بھی غیر معقول دیکھے تھے، جواب کے طور پر ہم نے بھی اپنی خانہ بردوشی اور صحرا نشینی کی سرگذشت بلا اختصار گوش گذار کر دی تھی کہ مبادا اس جانب سے کسی غلط فہمی کی گنجائش باقی نہ رہ جائے، لیکن اس طلسم گفتار کا سلسلہ ٹوٹتا نظر نہیں آتا تھا۔ اب ایک اصرار کیا جا رہا تھا کہ دنیا کی ساری زبانوں کے بمقابلہ یونانی زبان میں زیادہ ظرف ہے اور مجھے یہ زبان زباں آوروں سے ضرور سیکھنا چاہیے اس لئے کہ یہی زبان دنیا کی ساری زبانوں میں اول اول علم و حکمت کی تحقیق اور تدقیق کا واسطہ بنی تھی۔ اور اسی سرزمین سے اقصائے عالم میں علم و حکمت کی شعاع ریزی ہوئی تھی اور آج کی سائنس کی دنیا اس کی ممنون منت ہے۔ اور یہ دعویٰ غلط نہیں تھا۔

پھر تو آگے چلکر ہمیں تحصیل زبان کے لئے چند اساتذہ ملے تھے، ہمیں ان کے درِ دولت پر آسانی سے سب سے پہلے انہی کی خدمات حاصل ہوگئی تھیں اور صلے کے طور پر انکی انگریزی زبان کی تحصیل کے لئے ہمیں اپنی بھی کچھ خدمات وقف کرنی پڑی تھیں۔ اور حسب ضرورت ہم نے اس زبان میں کیقدر دسترس حاصل کرلی تھی۔ پھر پاپا اور میڈم کے اصرار پر ان کے سامنے بھی زانوئے تلمذ

ختم کرنا پڑا تھا اور انہیں تو فارسی زبان میں کامل دستگاہ حاصل تھی۔ خاص کر میڈم نے اس ہیچ مداں کے لئے جو اپنی گراں خدمت کی ارزانی فرمائی تھی اور شفقت اور محبت کا جو مظاہرہ کیا تھا اس کا کوئی صلہ نہیں ہو سکتا تھا سوا اس کے کہ ان کے ہاتھوں غلام بے درم کی طرح بک جاتے۔ اور بک نہیں سکتے تھے کہ ہم خریدے گئے تھے۔ فرنگی شیشہ گروں کے ہاتھوں جو عرق فروشی کرتے تھے اور ہمارے دماغ کے پیہم عرق نکالتے رہتے تھے۔ اور دن بھر کی عرق ریزی کے بعد جو ہم اس در دولت پر حاضر ہوتے تو کچھ تحفے اور ایک نیازمندی کے سوا ہماری تحویل میں اور کچھ نہیں ہوتا۔ تحفے سے تو میڈم کو ازلی منافرت تھی کہ وہ محض مادی چیزیں تھیں البتہ وہ ہمارے جذبات نیاز مندی کی قدر شناس تھیں۔ ہمارے ہاتھ میں تحفے دیکھتیں تو آتش زیر پا ہو جاتیں لیکن ہماری سر فروشی بھی مسلم تھی کہ کبھی کبھی اپنی نیاز مندی کو نذرانے کی صورت میں مادیت کا جامہ عطا کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ لیکن آگے چل کر کسی قدر محتاط ہونا پڑا تھا۔ ایک دن انکی دختر نیک اختر نے دوران گفتگو میں اپنے کسی خیال کے زیر اثر ایک بے تکی بات کہہ دی تھی۔

"اب تو آپ ہم لوگوں سے ضرور محبت کرنے لگے ہونگے"

انہوں نے اظہار خیال کیا تھا۔

"بلا شک و بلا ریب ہم آپ لوگوں سے محبت کرتے ہیں لیکن وہ ایک بے لوث محبت ہے"، ہم نے جواب دیا تھا۔

"پھر تو آپ کو اس بے لوث محبت کی بھی کچھ توضیح کرنی ہوگی"،

انہوں نے اصرار کیا تھا۔

"آپ لوگوں کی عالی ظرفی اور بلند اخلاقی مسلم ہے" ہم نے جواب دیا تھا، "حالانکہ میں رابطۂ بے علت کا کبھی قائل نہیں باوجود اسکے آپ کی یہ خاندانی وحدت میرے لئے ایک اہم چیز ہے اور میرے دل میں تو اس کے لئے نیاز مندی الفت اور محبت سبھی کچھ ہے"

"فرداً فرداً نہیں؟" انہوں نے شر آمیز سوال کیا تھا۔

"فرداً فرداً بھی۔ لیکن ایک مقررہ حد تک تاکہ اس وحدت کی بنیاد متزلزل نہ ہو جائے" ہم نے محتاط ہو کر جواب دیا تھا۔

"معاف کیجئے گا میں کسی قدر راست گفتار اور فطرتاً کسی قدر بے پروا بھی واقع ہوئی ہوں" انہوں نے اپنی طبیعت کی سحر طرازی کا مظاہرہ کیا تھا۔ "اور یہ شاید میری ایک کمزوری بھی ہے۔ جسکی بنا پر کچھ شرمندگی بھی دامنگیر ہوتی ہے۔ اب آپ دیکھئے نا اگر میں ایک صحیح بات کہوں کہ آپ صرف "مجھے" چاہتے ہیں جس کی وجہ سے آپ ہمارے خاندان کو بھی شدت سے چاہنے لگے ہیں تو آپ ضرور برا منائیں گے، اس لئے کہ آپ کی جانب سے ابتک اقرار باللسان نہیں حالانکہ اہم شواہد اس کی صریحاً غمازی کرتے ہیں"

یہ فقرے سماعت کے لئے اسقدر اختلاج آور تھے کہ ہم پر سکتے کا عالم طاری تھا۔ آپ کہیے کہ ہم گویا آفاق سے گرے تھے۔ ایک

عرصے کے بعد ہم ہوش میں آئے تھے۔

"آپ نے ابھی ابھی جو کچھ کہا۔ نا۔ شاید اس کے صحیح مفہوم سے آپ بخوبی واقف ہونگی"، ہم نے جذبذ ہو کر سوال بھی کر ڈالا تھا۔

"اور آپ بھی ایسے ناسمجھ نہیں کہ اسکا مفہوم نہ سمجھتے ہوں" انہوں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا تھا۔

"آپ ہمیں شاید ضرورت سے زیادہ بیوقوف سمجھتی ہیں" ہم نے احتجاج کیا تھا۔

"آپ اور بیوقوف۔ مطلق نہیں" انہوں نے تردید کی تھی۔

"آپ ہمیں کتنے عرصے سے جانتی ہیں؟" ہم نے استفسار کیا تھا۔

"ایک طویل عرصے سے جس کا علم آپ کو بھی ہے۔ لہٰذا یہ سوال مہمل بھی ہے" ان کے پاس دلایل اور براہین کی کمی نہیں تھی۔

"پھر تو معاملہ صفر ہی نظر آیا ہوگا" ہم نے تشریح کر دی تھی "وہ کہ ہم ایک اجنبی خانہ بدوش صحرانشیں سے زیادہ کچھ نہیں اور ہماری خانہ بر اندازی کا عالم کسی سے مخفی نہیں۔ پھر اپنی پوزیشن کا صحیح علم بھی ہمیں حاصل ہے، علاوہ اس کے آپ کے عالی مقامات کے احوال بھی میری نگاہوں سے اوجھل نہیں۔ بپیش نظران احوال کے یہ میری جرائت نہ مجال نہ طاقت نہ تاب و تواں۔ ہرگز ہرگز نہیں!!"

"پھر تو آپنے میرا مفہوم ٹھیک "ہٹ" نہیں کیا" انہوں نے اطمینان

سے جواب دیا تھا۔" میں یہ کہہ رہی تھی کہ صحیح محبت وہ ہے جس

کے سارے پہلو چور ہوں اور اس کی ساری جہتوں میں مطابقت

اور مصالحت ہو۔"

"اور مجاز! میں آپ کا مفہوم ٹھیک کرنے سے قاصر بھی ہوں،" ہم نے

بات ختم کر دی تھی اور سگریٹ کا ٹن پاکٹ سے نکال لیا تھا اور ٹن سے

سگریٹ نکال کر ٹیبل پر سے ماچس اٹھا رہے تھے کہ یاسمین نے

ماچس اچک لی تھی۔

"معذور کیوں نہ ہوں جبکہ آپ کو ہم لڑکیوں کی تکلیف کا کچھ پتہ نہیں"

انہوں نے بے تکی باتیں شروع کر دی تھیں "اور آپ لڑکیوں کے

بارے میں کچھ جان بھی نہیں سکتے۔ درآنحالیکہ آپ کو تا لج نہیں کہ

ہم پر جوانی ایک بیک ہی کیوں ٹوٹ پڑتی ہے، جوانی جب آتی

ہے تو ایک طوفان کی طرح کیوں اٹھتی ہے۔ آندھی کی طرح کیوں

چڑھتی ہے، بادل کی طرح کیوں گھرتی ہے۔ اور گھٹاؤں کیطرح

کیوں برستی ہے، دل کی دھڑکین کیوں بڑھتی ہیں، نگاہیں پریشان

کیوں ہوتی ہیں اور قدموں کو لغزشیں کیوں ہوتی ہیں؟"

اور یاسمین نے نگاہیں میرے چہرے پر اس طرح مرکوز کر دی تھیں

کہ گویا بہت سارے جواب میرے چہرے پر منقوش تھے اور ادھر

اپنی نگاہیں سارے جواب خلاؤں میں ڈھونڈ رہی تھیں۔

"میرے پاس اتنے سارے سوالوں کا اک بیک جواب نہیں۔ یہ

باتیں کیوں ہوتی ہیں اور کیوں نہیں ہوتی ہیں آپ کو مجھ سے پوچھنے
کا کوئی حق بھی نہیں،، ہم نے ان سے ماچس طلب کی تھی ،، آپ اس
سلسلے میں کسی ماہر جنسیات ڈاکٹر کی خدمات حاصل کیجئے، اس سے
اپنا معاینہ کرائیے اور پھر ان سارے سوالات کا جواب اس سے
طلب کیجئے۔ میرے پاس کوئی جواب نہیں،،
انہوں نے مجھے ماچس دے دی تھی اور ہم نے سگریٹ سلگا لیا تھا۔
،، ڈاکٹر گدھا کیا جانے۔ سارے جواب میرے پاس ہیں اور آپکی
آگاہی کے لئے لگے ہاتھ اتنا ہی کافی ہے ،، انہوں نے فطرتِ
نسوانی کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی تھی۔ ،، کہ ہم لڑکیاں ساخت
کے لحاظ سے کچھ ایسی ہیں کہ عمر کے ایک خاص دن ہمارا ذہن اور ہمارا
جسم ایک دوسرے سے بہت قریب ہو جاتے ہیں۔ اور اس دن
سے ہماری ذہنی بالیدگی عمر کی بالیدگی میں منتقل ہونے لگتی ہے اور
اس بالیدگی کا سبب مرد کا وہ پہلا تخیل ہے جو اس دن ہمارے
ذہن پر مسلط ہو جاتا ہے، پھر ذہنی بالیدگی کے ساتھ ساتھ جسمانی
بالیدگی وہ شدت اختیار کر لیتی ہے کہ بلوغت کی دہلیز پر قدم رکھتے
ہی رکھتے چشم زدن میں سارے زینے طے ہو جاتے ہیں اور ہم آناً
ناناً میں جوانی کے معراج کو پہونچ جاتے ہیں،،
اب کے یاسمین نے نگاہیں خلا میں منتقل کر دی تھیں اور ہماری نگاہیں
خلا سے منتقل ہو کر ان کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

"تو گویا آپ کسی مرد سے قبل ہی سے محبت کرتی ہیں" میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا تھا۔

"بے شک لیکن وہ گوشت پوست کا کوئی انسان نہیں بلکہ مرد کا محض ایک تخیل ہے!" اور ان کی نگاہیں میرے چہرے پر منتقل ہو گئی تھیں اور چہرے سے ٹکرا کر ٹیبل پر منبذول ہو گئی تھیں اور انہوں نے سگریٹ کا ٹن اٹھالیا تھا اور پھر میرے چہرے کا مطالعہ شروع کر دیا تھا۔

"لگے ہاتھ ایک دوسرا سوال بھی حل ہو جائے، اب آپ یہ بتایئے اس ٹن میں کتنے سگریٹ ہیں" یاسمین نے سگریٹ کے ٹن کو قرینے سے بند کرتے ہوئے سوال کیا تھا۔

"مجھے معلوم نہیں۔ آپ گن لیجئے۔ عام طور سے ایک نئے ٹن میں پچاس سگریٹ ہوتے ہیں" ہم نے سگریٹ پھینکتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"اور غالباً یہ ٹن بلا شرکتِ غیر آپ ہی کے زیرِ استعمال رہا ہوگا؟" انہوں نے جرح کی تھی۔

"بے شک!"

"اب آپ دیکھئے حالانکہ میرے سوال کا جواب آپکے پاس ہونا چاہیئے تھا لیکن یہ بات نہیں" انہوں نے تشریحات شروع کر دی تھیں "لہذا یہ طے شدہ بات ہے کہ آپکے بہت سارے اعمال

ایسے ہیں جن سے آپ خود بے خبر ہیں کیونکہ آپ یہ نہیں بتا سکتے کہ آپ نے ٹن سے ابتک کتنے سگریٹ نکالے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس آپ شاید یہ بھی نہیں جانتے کہ آپ ایک جوان لڑکی سے اسطرح روزانہ کیوں ملنے چلے آتے ہیں اور مجھے یقین ہے اس سوال کا جواب آپ کے پاس نہیں درآنحالیکہ اس سوال کا جواب میرے پاس بھی نہیں کہ میں خود روزافزوں آپ کی جانب کیوں کھنچتی جارہی ہوں ۔۔۔ کیا آپ ان باتوں کا محاسبہ کرسکتے ہیں؟ ظاہر ہے نہیں کر سکتے!"

"یہ تو وہی چاہ کندن اور موش برآوردن یعنی اقرارِ محبت والی بات ہوئی۔ لیکن آپ کو جب یہی کہنا تھا تو اسقدر تمہید کی کیا ضرورت تھی"۔۔۔ ہم نے ان کے ہاتھ سے سگریٹ کا ٹن لے لیا تھا اور چل دیئے تھے۔

"آپ ابھی نہیں جاسکتے بعد کو چلے جائیے گا"، انہوں نے ہمیں روک دیا تھا۔

"لیکن مجھے اب جانا چاہیئے اس لئے کہ یہ اطلاع میرے لئے بہت زیادہ ہے"، ہم نے اصرار کیا تھا۔

"کچھ اطلاعات اور بھی ہیں وہ بہت زیادہ اہم ہیں اور آپ کے لئے بیحد کام کی ہیں انہیں بھی لیتے جائیے"، انہوں نے بات کاٹ دی تھی "حالانکہ یہ ایک فطری بات ہے کہ ہر جوان اپنے کو جوانمرد

اور ہر لڑکی اپنے کو ماہ کنعاں سمجھتی ہے، لیکن قدرت کی نگاہیں کچھ اور کہتی ہیں۔ اور قدرت کی راہیں بھی کتنی عجیب ہیں کہ محبت ہی ہماری خمیر میں ہوتی ہے، باوجود اسکے ہم لڑکیوں کو کسی عاشق کی تمنا کبھی دامنگیر نہیں ہوتی۔ ہم کبھی اس بات کے تمنائی نہیں کہ کوئی ہمارا عاشق ہو۔ اور وہ ہماری جوانی کے اس بڑھتے ہوئے طوفان کو اپنی ہتھیلیوں پر تھام لے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنی فطرت کے پابند ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہم لاکھ لڑکیاں سہی تاہم آخرکش ہم انسان ہی ہیں اور اس لحاظ سے ہماری اپنی تمنائیں، آرزوئیں اور امنگیں ہوتی ہیں، چنانچہ ہم فطرت سے مجبور سب سے پہلے اپنے عاشقوں کو ٹھکرا دیتی ہیں اور پھر بعد میں ایک ایسے شخص کی تلاش میں ہوتی ہیں جن سے ہم خود محبت کرسکیں —— میرا خیال ہے میں نے سب کچھ کہہ دیا۔ اب آپ سمجھنے کی کوشش کیجئے"

اور انہوں نے میرے چہرے کا بغور مطالعہ کرنا شروع کردیا تھا۔

"آپ میرے چہرے کا مطالعہ کیا کرتی ہیں۔ کچھ اور باتیں ہیں تو وہ بھی کہئیے" ہماری زبان سے غیر ارادی طور پر نکل گیا تھا۔

لیکن انہوں نے لب و لہجے سے بہت ساری باتیں سمجھادی تھیں۔

"حالانکہ آپ کو مجھ سے یہ سوال پوچھنا چاہئے تھا کہ ہم نے کسی ایسے مذکورہ شخص کی تلاش کرلی ہے یا نہیں لیکن پھر بھی اس کو آپ کی دانشمندی پر محمول کروں گی کہ آپ نے یہ سوال نہیں پوچھا اسلئے کہ

یہ سوال جواب کی چیز نہیں بلکہ فی نفسہ محسوس کرنے کی چیز ہے“
یاسمین کا لب و لہجہ ایک درد نہانی کی ترجمانی کر رہا تھا۔

انفاس قدسیہ :-

مجازاً اس ملاقات کی تمہید ایک عجیب اور دلچسپ انداز میں ہوئی تھی
واقعہ یوں ہے کہ ایک دن ایک طویل برفباری کے بعد آسمان صاف ہو چکا تھا
بھیگا بھیگا موسم تھا اور بھیگا بھیگا سماں ۔ سورج نے ایک طویل عرصے کے بعد
دن کے آخری لمحوں میں ایک دفعہ جھانکنے کی کوشش کی تھی ۔ اور پھر اپنی سرخ سرخ
شعاعوں کو جلد جلد سمیٹ کر گویا افق کی رنگینی میں کھو گیا تھا ۔ پھر ایک چمکدار اور
پھڑ پھڑاتا ستارہ افق سے ابھرا تھا اور شام کا دھندلکا روشنی
کے عقب میں آہستہ آہستہ رینگنے لگا تھا ، پھر فضا میں ارتعاش کی سی کیفیت
پیدا ہوئی تھی ۔ اور برف سے لدے ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے چلنے لگے تھے
جانے دل میں ایک کسک سی کیوں پیدا ہو رہی تھی جس کے کچھ ظاہری اسباب بھی
پیدا نہیں تھے ، لیکن سر میں کچھ میٹھا میٹھا سا درد تھا ۔ اس کے اسباب ظاہر تھے کہ

سرد ہوا اس وقت قہر ہی برسا رہی تھی۔ لیکن قدم بے ساختہ شہر کی جانب اٹھ رہے تھے، شہر کیا تھا؟ ایک کوہستانی شہر جو ایجین سی کے ساحل پر واقع تھا اور درحقیقت پہاڑ کی چوٹی سے لے کر دامن تک پھیلا ہوا تھا۔ گو سمندر کے ساحل پر واقع تھا لیکن اچھا بندرگاہ نہیں تھا۔ جہاں بڑے بڑے بحری جہاز لنگر انداز ہو سکتے تھے، لہٰذا بحری رسائل کا "سلونیکا" کی بندرگاہ پر ہی دارو مدار تھا۔ باوجود اس جغرافیائی عیب کے شہر بے حد حسین تھا۔ شام کا سہانا سہانا وقت اور سارا ماحول ایک فتنۂ بیدار سے کیا کم تھا۔ ایسے وقتوں میں شہر کی آبادی عمارتوں اور ایوانوں میں نہیں بلکہ سڑکوں اور پارکوں میں ہوتی ہے۔ حسن تو وہاں یوں بھی برہنہ اور بے نقاب ہے لیکن خاصکر ایسے وقتوں میں اس میں بے حجابی کی ایک طغیانی سی آجاتی ہے۔ اور وہ شام تھی کہ اس وقت کوچوں اور بازاروں میں اور پارک اور رقص گاہوں میں نیم برہنہ اور بے محابا جلوؤں کی بارش ہو رہی تھی اور نادانستہ اور بیساختہ حسن کی نمائش ہو رہی تھی۔ فن اور آرٹ کے مبادیات سے لیس کچھ "لافانی" حسن و نزاکت کا ایک مظاہرہ ہو رہا تھا، کچھ ڈھلتی اور لڑھکتی ہوئی جوانیوں کی بھی ایک نمائش ہو رہی تھی۔ جن کے کھٹکے اور مرکتے ہوئے محاسن کو غازہ اسنو، لپ اسٹک اور کریم وغیرہ کی نقاب میں الجھا کر اٹکا لینے کی قابل داد کوشش کی گئی تھی جس سے عقل حیوانی تو خیر عقل سلیم بھی دھوکہ کھا جاتی تھی اور شکوہ ہوتا تھا خدائے لم یزل سے کہ حسن و نزاکت کا صیغہ سارا کا سارا عشق کے پروردگار کیوپڈ کے کیوں سپرد کیا گیا کہ اسنے رفتہ رفتہ کرۂ مغربی

پر اپنا تسلط مکمل طور سے جمالیا تھا۔ اور وہ دعویٰ کر رہا تھا۔
"ازلی صداقتوں کا دامن ہمارے ہاتھ میں ہے" ـــــ اور اس کرۂ خاک سے مستی کی صدائیں بلند ہوتی تھیں اور دامانِ خیال ہاتھوں سے چھوٹا جاتا تھا در انحالیکہ منظر کی نزاکت سے متاثر ہوئے بنا ہم نہیں رہ سکتے تھے چنانچہ پریشانیٔ خاطر اور پراگندہ دلی کا یہ عالم تھا کہ دردِ سر روبہ ترقی تھا اور ہم کیمسٹ کی دکان تلاش کرنے پر مجبور ہوئے تھے، اور اس کی تلاش میں سرگرداں ہوئے تھے۔ اور اس کے چلتے شہر کے چپے چپے اور گوشے چھان مارے تھے لیکن باوجود سخت تلاش اور تجسس کے کیمسٹ کی کوئی دکان ڈھونڈ نکالنے میں سراسر ناکام رہے تھے۔ سخت مایوسی کے عالم میں تھکے ہارے ایک ادبخچ چوک پر جا کھڑے ہوئے تھے۔ اور سوچ رہے تھے اب کیا کریں۔ کہ سامنے سے آتے ہوئے ایک شریف آدمی سے پوچھ بیٹھے تھے۔
"کیوں بھائی اتنے بڑے شہر میں کیمسٹ کی کوئی دکان نہیں؟"
اور قبل اسکے کہ وہ شریف انسان کچھ جواب دیتا ایک سادگی کے مجسمہ نے اور حسن و لطافت کے پیکر نے دخل در معقولات کیا تھا اور زیادتی ملاحظہ ہو اس نے نہایت سخت اور درشت لہجے میں کہا تھا۔
"یہ کیا خاصہ ہے آپ لوگوں کا۔ آپ صحیح طور پر دیکھتے بھی نہیں ورنہ یوں تو آپ کے عین پہلو پر صلیب احمر کے نشان کے نیچے کیمسٹ کی ایک بہت بڑی دکان جگمگا رہی ہے اور تکلف کی ضرورت ہی

کیا جبکہ میں آپ کو اس دکان تک پہونچائے دیتی ہوں"
خاصہ! اور پھر میرا نہیں "ہلو گوں گا" ـــــ ہم تو اس دوشیزہ کا منہ
تکنے لگے تھے کہ کیا کافر جوانی پائی تھی ۔ اور پھر اس پر یہ خاصہ!۔
اور ہمیں اپنے گائیڈ بک کی کچھ تشریحات کی صداقت پر کامل یقین
کرنا پڑا تھا کہ یونان کے لوگ علاوہ اپنی خوش خلقی، مہمان نوازی
اور دیگر صفات جامعہ اور کاملہ کے فطرتاً کسی قدر خیرہ سر بھی ہوتے
ہیں، لیکن اس خیرہ سری کا کیا جواب ہو سکتا تھا در انحالیکہ جنسِ لطیف
کی خیرہ سری کا کوئی جواب نہیں ۔ لیکن زبان سے بیساختہ نکل گیا تھا
"لایق تحسین ہے یہ ادا جو ایک دن کسی کو برباد کر کے رہے گی
لیکن معاف کیجئے گا مجھے آپ کی رہنمائی کی مطلق ضرورت نہیں!"
اور وہ شریف آدمی انسان نہیں غالباً شیطان تھے کہ قبل تو ان سے جواب
تک بن نہیں پڑا تھا اب دانت نکال کر ہنس رہے تھے ۔ اور جو دیکھا تھا تو اب
منجملہ نظر آیا تھا کہ پیچ پیچ ہی صلیب احمر کے نشان کے نیچے گھنے زیتون کے
درجنوں درختوں کے پس منظر میں نہایت آراستہ و پیراستہ کیمسٹ کی ایک
دکان تھی ۔ بلکہ غلط کیمسٹ کی ایک دکان بہ نفسِ نفیس موجود تھی اور شہر کی بلند
چوٹی پر دلہن کی طرح بنی سجائی جگمگا رہی تھی ۔ حالانکہ اپنی بصارت پر
یقین رکھتے ہوئے اس دکان کی تلاش میں سارا شہر ایک سرے سے دوسرے
سرے تک چھان مارا تھا اور لطف کی بات یہ تھی کہ خاص کر اس چوک کے بیشمار
چکر لگائے تھے لیکن یاد ہے صرف زیتون کے درخت نظر آئے تھے دکان

نظر نہیں آئی تھی اور پھر گھنے زیتون کے پس منظر میں وہ دکان نظر آتی تو کیونکر آتی۔ بہر کیف دوسرے لمحہ ہم اس دوشیزہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے تھے اور بلا کسی کی استعانت کے اس دوکان میں داخل ہو گئے تھے جو باہم شفاخانہ اور کیمسٹ کی دکان تھی۔ اور جب اسپرین خریدنے والے تھے ہم نے دیکھا تھا اس دکان پر ایک پیر خضر صورت کو اور تھوڑی دیر کے لئے شک ہوا تھا حضرت خضر یہاں کہاں؟ پھر دوسرے لمحہ اسی دوشیزہ کو دیکھا تھا یعنی اس شیر دل خاتون کو جو ابھی ابھی سر راہ کسی غریب الوطن سے دست بہ گریباں ہو رہی تھی۔ اب دکان کے چمکتے ہوئے کاؤنٹر پر اپنے عین مقابل رونق افروز تھی۔ پتہ چلا تھا وہ پیر خضر صورت دراصل مالک دکان تھے۔ حالانکہ حضرت اپنے حلقہ ہائے چشم و دہن کو پے در پے مرتعش کر رہے تھے کہ فوری طور پر کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن کچھ کہہ نہیں سکتے تھے کہ شاید نطق یارائی نہیں کر رہا تھا اور جو یہاں اسپرین کے ٹکیے مانگے تھے تو دفعتاً حضرت کی زبان کھل گئی تھی اور وہ اک بیک گویا ہو گئے تھے۔

”فش۔ اسپرین کیا۔ خیر دیکھو یاسمین۔ آپ چونکہ اسپرین مانگتے ہیں لہذا اوپر والے پہلے شلف سے نصف درجن اسپرین آپ کو لا کر دینا“ آپ نے ایک نمائشی لاپروائی سے اور ایک میکنکل انداز میں یاسمین کو تلقین کر دی تھی۔

پھر اس جانب انہوں نے انگشت نمائی بھی کر دی تھی۔ اور تو اور یہاں اس انگشت نمائی کا مفہوم سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ شاید اس سے مراد یہ تھی کہ دوا خاکسار ہی

کو لا کر دی جائے۔ حالانکہ خاکسار کے سوا اس دکان میں دوسرا خریدار ہی نہیں
تھا۔ المختصر یہ کہ اس انگشت نمائی کا مفہوم سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اور یہاں دوشیزہ کا
نام معلوم ہو گیا تھا۔ کیا؟۔ یاسمین۔ یعنی چہ؟ یاسمین۔ طبیعت میں آئی تھی نام نوٹ
کر لوں۔ اور استغفر اللہ کس قدر اختلاج آور یہ نام تھا اور ادھر دھیان اس جانب
منعطف ہو گیا تھا اور ایتھنز کی وادیوں کے گل یاسمین کے پر پیچ بیلوں میں جا الجھا تھا
اور غور کر رہے تھے اس دلنوازی پر جو گل یاسمین کی ایک خاصیت تھی اور
پھر سوچ رہے تھے اس یاسمین کے خد و خال کی لطافت اس کے باطن کی درشتی
سے کیا مطابقت رکھتی تھی کہ اس اثنا میں بزرگوار اسی شلف کی طرف گئے تھے
اور اس سے ملحقہ دروازے سے گذر کر درون خانہ چلے گئے تھے اور یاسمین اسپرین کے
بجائے ایک عجیب دوا لائی تھی۔ نام نہایت بے ڈھنگا تھا "PONOKATASTR OPOS"
تلفظ زبان پر بمشکل چڑھتا تھا، پھر زیادتی یہ کہ اس دوا کو اپنے ایک بے ساختہ
انداز و ادا اور ایک دلفریب مسکراہٹ کے درمیان کاونٹر پر دھکیل دیا تھا
اور دوا گرتے گرتے بچی تھی، اس بزنادہ سے توانیا دردِ سر رفع ہو گیا تھا۔ لیکن دوا ہم
نے مصلحتاً رکھ لی تھی اور جیب کے حوالے کر دی تھی۔ پوچھا بھی نہیں تھا کہ وہ
لگانے یا کھانے کی دوا تھی۔ پھر اس کی قیمت بھی ادا کر دی تھی لیکن کوئی بات تھی
کہ دل نہیں مان رہا تھا، پھر تو ہم نے ہاتھ پتلون کے پاکٹ میں ڈال دیا تھا اور
کچھ نہیں تو انتقاماً پاکٹ سے سگریٹ کا پیکٹ ہی نکال لیا تھا۔

"آپ سگریٹ کی عادت ڈالئے اور غصے کے اوقات دھوئیں کا سہارا
لیجئے" ہم نے ایک عدد سگریٹ سلگایا تھا اور ایک عدد اُسے پیش کر دیا تھا۔

"یہ کھلی زیادتی ہے!" اسنے سگریٹ ہمارے ہاتھ سے اچک لیا تھا اور اسکے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا اور اسقدر برہم ہوئی تھی کہ یہاں گویا نہایت ہی سنگین جرم کا ارتکاب ہو گیا تھا اور ہم پر حدِ شرع لگ سکتی تھی، پھر معاً ایک دلفریب مسکراہٹ اس کے لبوں پر مچل گئی تھی جو ایک گہرے طنز کی ترجمانی کر رہی تھی۔

"انداز و ادا کا جواب نہیں، لیکن معاف کیجئے گا آپلوگوں کا یہ کیا خاصہ ہے کہ آپ صحیح طور پر سنتی نہیں ورنہ اس عجیب الخلقت دوا کے بجائے میں نے مقررا سپرین کے ٹکیے مانگے تھے"۔ ہم نے بعینہٖ اسی کے الفاظ مستعار لے کر اس سے شکوہ کر دیا تھا اور پھر رخصت ہو گئے تھے۔ اور قدم رک گئے تھے کیونکہ یاسمین کے لبوں پر جو دلفریب مسکراہٹ بکھر گئی تھی آن واحد میں سمٹ کر رخصت ہو گئی تھی اور اس کی کچھ نگی فشانیاں میرے لئے پابہ زنجیر ہو گئی تھیں۔

"تمیز نہیں۔ اسپرین اور "عجیب دوا" دو نام ہیں یہ چیزیں ایک سی ہیں!" وہ مشتعل ہو گئی تھی۔

حالانکہ اشتعال کا کوئی مقام نہیں تھا درآنحالیکہ مطلوبہ دوا اگر اسٹاک میں نہیں تھی تو محض ایک معذرت کافی تھی۔ پھر اشتعال کا سبب میری کوئی خطا نہیں تھی بلکہ اس کی اپنی جارحیت پسند ذہنیت تھی جو اجنبی لوگوں پر خواہ مخواہ حملہ آور ہونا چاہتی تھی۔ البتہ اس کے سلوک میں ایک شوخی اور بے ساختگی

تھی جو بے حد مرغوب خاطر تھی کہ وہ خالص جوانی کی ادا تھی اس لحاظ سے
وہ کتنی خوبصورت اور کسقدر حسین تھی کہ وہ کبھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی تھی لیکن
یہ کیا وہ ایک خونخوار بلی تھی جو انسان کی صریحاً بیعزتی کرسکتی تھی اور کھلی توہین کرسکتی
تھی ۔ اور پھر قومی توہین! ۔ اِسے برداشت کرنے کی عادت ہی نہیں تھی، چنانچہ
تبادلۂ خیال کے لئے ہمیں رکنا ہی پڑا تھا ۔
" اتنی بھی خیرہ سری کیا ۔ بتیز تمہیں نہیں ۔ چہ جائیکہ تمیز کا ایک روشن پہلو
ان دواؤں کے دو مختلف ناموں میں اعلانیہ موجود ہے " ہم نے سخت الفاظ
استعمال کردیئے تھے ۔
" اگر ہو بھی تو چنداں مضائقہ نہیں " اُسنے لاپروائی سے جواب دیا تھا
" خیر یہ ایک بات ہوئی ۔ لیکن اگر میں اپنی اطلاع کے لئے یہ جاننا چاہوں
کہ آپ کسی کالج یا اسکول میں تعلیم پاتی ہیں تو شاید برا نہیں " ۔ ہم نے اس
کی تعلیم پوچھی تھی ۔
" پہلے ضرورت بتایئے ؟ " وہ سرو قد کھڑی ہوگئی تھی ۔
" پہلے کوئی ضرورت نہیں تھی لیکن اب اتفاق سے پیش آگئی ہے " ہم
نے تاکید کی تھی ۔
" میں مقامی کالج کے سکنڈ ایر سائینس میں پڑھتی ہوں " وہ
اعتدال پر آگئی تھی ۔
" آپ " ٹامگر گرل " جانتی ہیں ؟ " ہم نے استفسار کیا تھا ۔
" آپ کہنا کیا چاہتے ہیں ۔ وہی کہیئے! " وہ پیچ کھا گئی تھی ۔

"آپ اس حسین لکھڑے میں ہر جستہ ایک شیرنی ہیں اور آپ سے پہلی ملاقات پر ہر انسان کو ایک خطرہ لاحق ہے۔ آپ سمجھیں !" ہم نے قطع کلام کیا تھا۔

"آپ دلچسپ آدمی نظر آتے ہیں" اس نے اپنا موقف بدل لیا تھا

"میں دلچسپ آدمی نہیں لیکن لوگ مجھے ایسا سمجھتے ہیں" ہم نے وار خالی دیا تھا۔

"آپ اشتیاق انگیز حد تک دلچسپ ہیں" وہ شکست کھا گئی تھی۔ اور ہم نے بات ختم کر دی تھی۔

"آپ شرمائیں نہیں یہ آزاد سوسائٹی ہے چنانچہ آپ کو ہر بات کہنے کی مکمل آزادی ہے۔ کچھ بات کہنا ہے ؟" اسنے پھر دوسری جارحیت شروع کی تھی۔

"لیکچر میں جو شر مار رہا ہوں میری کس بات سے آپ نے اخذ کیا؟" ہم نے باز پرس کی تھی۔

"خیر ان باتوں کو جانے دیجئے۔ اب آپ یہ بتائیے آنکھوں سے کس چیز کی تمیز کی جاتی ہے ؟" اس نے پھر اچانک کا حملہ کیا تھا۔

"آنکھوں سے کسی چیز کی بھی تمیز نہیں کی جاتی" ہم نے حملے کا ارتداد کیا تھا۔

"آپ مجھے کسطرح دیکھتے ہیں ؟" اس نے اپنی مثال پیش کی تھی۔

"میں آپ کو قطعی نہیں دیکھتا" ہم نے مشاہدہ سے انکار کیا تھا۔

"یہ تو کوئی جواب نہیں!" اس نے گلہ کیا تھا۔

"جواب کیوں نہیں، ضرور جواب ہے۔ اور یہ جواب خود آپکے پاس ہونا چاہیئے تھا۔ درانحالیکہ آپ سائنس کی اسٹوڈنٹ ہیں" ہم نے اسے نیچا دکھایا تھا "آپ کے مجسمہ سے کچھ شعاعیں خارج ہوتی ہیں اور وہ بے تاب شعاعیں مشاہد کے قرۃ العین سے گذر کر اس کے دماغ میں داخل ہوتی ہیں اور ایک احساس کی تخلیق کرتی ہیں، تبھی وہ سمجھتا ہے کہ اس نے آپ کو دیکھا ورنہ یوں دیکھنا ایک عامیانہ مذاق گفتگو ہے جو حقیقت افعال پر مبنی نہیں"

اور نگاہیں جو اٹھی تھیں تو دیکھا تھا سامنے حضرت بزرگوار اپنے سیاہ پتلون سیاہ کوٹ اور سرخ ٹائی کے دلکش امتزاج میں اسطرح کھڑے تھے جس طرح بکنگھم پیلیس کی دیوار پر کسی ڈیوک کی تصویر آویزاں ہو اور یہاں پہلی نظر میں ان پر تو گمان تصویر ہی کا ہوا تھا حالانکہ حضرت نے اپنے حلقہ ہائے چشم و دہن کو مرتعش کرنا شروع کر دیا تھا۔ آپ شاید اس وقت ہم سے مخاطب تھے "تم اپنے حواس سے پوچھو" لیجئے آپ آخر گویا ہو ہی گئے تھے "اور محسوسات سے دریافت کرو کہ وہ تشنگی کیا تھی جو تمہارے قلب میں ڈالی گئی تھی اور پھر تم دیکھو تم میں وہ تشنہ کامی کہاں اور سوچو تمہاری وہ اداشناس نگاہیں کہاں ورنہ دنیا کے اس دور

میں مقرر اور لاریب اس عفتِ مجسم اور انفاسِ قدسیہ نے دوبارہ
جنم لیا ہے۔ سمجھتے ہو عفتِ مجسم؟"
حالانکہ ہم سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے اور یاسمین سرنگوں تھی، لیکن
یہ مشکل آپ آسان ہو گئی تھی، عالی حضرت نے خود ہی سمجھا دیا تھا کہ کس
طرح روح القدس نے ایک شب ان کی بالین پر جلوہ افروز
ہو کر بشارت دی تھی کہ وہ مقدس روح کسی جسدِ خاکی میں دوبارہ
منتقل ہوئی ہے اور عین وہی ساعت تھی کہ یہ لڑکی پیدا ہوئی تھی۔
ہم تو سمجھ گئے تھے لیکن عقل یہاں سمجھنے سے قاصر تھی کہ انصافاً اس
لڑکی کی تخصیص کیا جبکہ اس اہم ساعت میں ہماری دنیا کے پلانٹ
پر بیشمار لڑکیوں کے علاوہ ان گنت لڑکے بھی پیدا ہوئے تھے۔ یہ
ہم کیا کہہ سکتے تھے، البتہ نطق نے کسی قدر عبارت آرائی کی تھی۔
"محترمی" ہم نے عرض کر دیا تھا "پلیز پرفیور ے۔ حالانکہ یوں
بھی ایک بات واضح اور مسلم ہے کہ انفاس قدسیہ کے قدم بابرکت
ہی سے یہ کاشانہ گہوارۂ انوار بنا ہوا ہے تاہم اگر قلب ماہیئت کے
سلسلے میں تذکرہ اس مخصوص لڑکی کا ہے تو فی الحال میں کچھ عرض
نہیں کر سکتا"
یہ بات تو ہم نہ جانے کس طرح کہہ گئے تھے لیکن یاسمین اب سرنگوں
نہیں تھی بلکہ سر و قد کھڑی تھی اور خون کے گھونٹ پی رہی تھی۔
خشمگیں لہجے میں مخاطب تھی لیکن بات نہیں کہہ رہی تھی۔ اور بات

کہنے کی نہیں حضرت کی شیریں مقالی کی سماعت نوازی میری سماعت کے لئے چنداں اختلاج آور نہیں تھی۔ درآنحالیکہ ہم "مذاکراتِ علمی" کے سننے کے سلسلے میں بڑی بڑی حماقت اور جہالت کی باتیں سننے کے عادی تھے اور پھر عالی حضرت کی کیا بات تھی ہم تو کچھ کہہ ہی نہیں سکتے تھے، البتہ ہمیں کافی تجربہ ہو چکا تھا کہ یورپین "پیپنے سنس" کی یورش اور یلغار سستیِ فکر اور ضعفِ اعتقاد کا ہنوز ازالہ نہیں کر سکی تھی اور کچھ شبہات میرے ذہن میں پیدا ہوئے تھے کہ انسانی سوسائٹی میں اس قسم کے کیرکٹر استحصالی کیرکٹر ہو سکتے تھے۔ لیکن خاکم بفرق حضرت استثناؤں میں سے تھے کہ درحقیقت وہ اپنی غیر متزلزل معصومیت اور لافانی حسنِ سیرت کے مالک تھے ان کے حق میں ہم اسی قدر رائے قائم کر سکے تھے کہ یاسمین نے ہم پہ ایک برجستہ حملہ کر دیا تھا۔

"واضح اور مسلم ہوگا آپ کا سر آپ تقدیس و طہارت کو کیا سمجھیں!" اس نے مجھے آڑے ہاتھ لیا تھا۔

"وہ تو خیر ہوگا ہی لیکن یہ کیا بات بنی" ہم اس کے لئے قطعی تیار نہیں تھے۔

"بات کیا بنے گی، تقدیس و طہارت کی بات پیچھے ہوگی" اس کا تو موڈ بیچ ہی بگڑ گیا تھا "پہلے آپ صحیح صحیح یہ بتائیے کہ آپ شہر کی بالائی "ہل اسٹیشن" پر کس سلسلۂ شوق سے آتے جاتے رہتے ہیں؟"

اس کا تو ہمیں تا ہنوز علم نہیں تھا کہ اس نواحی میں کوئی ایسا مقام بھی تھا جو " ہل اسٹیشن " کہلاتا تھا اور جہاں کچھ سلسلۂ شوق کا محلِ وقوع تھا لہٰذا یہ سوال بالکل مہمل اور قطعی لغو نظر آیا تھا۔ اور یاسمین کی اس " صحیح صحیح " کا جواز تو میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا اور ہمیں یاد نہیں آرہا تھا کہ اس سلسلے میں ہم نے اُسے اپنے افعال و اعمال کے محاسبے کی اتنی ساری اتھارٹی کب دے دی تھی۔

" ہل اسٹیشن " پر گئی ہونگی آپ جو آپ کو یاد آتا ہے۔ ہم کوئی ہل اسٹیشن نہیں جانتے " ہم نے استقامت کے ساتھ جواب دیا تھا پھر تو اس نے ڈیسک پر کہنیاں ٹیک دی تھیں اور اپنے رخسار کو کسی قدر آرٹ کے ساتھ ہتھیلیوں کا سہارا دیا تھا۔ انداز کہہ رہا تھا کہ اس کے اقوال میں احوال کی بھی آمیزش تھی۔

" خیر یہ ایک بات ہوئی " اسنے اب جرح شروع کی تھی " اب آپ یہ بتلائیے آپ سیر و تفریح تو ضرور کرتے ہوں گے اور اس غرض سے کہیں نہ کہیں ضرور جاتے ہوں گے "

" سیر تفریح " ہمیں حیرت ہوئی تھی " ہم غریب الوطن کی سیر و تفریح بھی کیا۔ کبھی شہر کو آئے۔ اس کی بلندی اور پستیوں کو عبور کرتے ہوئے تھک گئے اور پھر اپنے ٹھکانے پر پہونچ گئے۔ آپ اس کو سیر و تفریح جو کچھ بھی کہہ لیں "

" آپ نے شہر کی " مغربی چوٹی " کا منظر تو ضرور دیکھا ہوگا؟ "۔

اس نے مزید جرح کی تھی۔

" اگر دیکھا بھی ہو تو کون سا گناہ کیا اور مزید براں آپ نے بھی اسے ضرور دیکھا ہے اس لئے کہ بغیر دیکھے آپ بھی اسکا تذکرہ نہیں کر سکتی ہیں " ہم نے بھی اس کے دلائل کی رد کی تھی

لیکن وہ ماننے والی کب تھی اسنے ڈیسک پیٹ دیا تھا۔

" وہ رے آپ۔ یعنی کہاں؟ آپ کس صفائی سے اقرار کر لیتے ہیں کہ شبہ کی کوئی گنجائش نہیں " اب تو وہ حاوی ہو گئی تھی۔

"لیکن الزام کی قبا اپنے بدن پر چست نہیں آئی " ہم نے اس کے سارے دلائل کی تردید کی تھی۔

" بڑی بات ہے کسی کی آزادی میں اس طرح رخنہ نہیں ڈالتے " اور پاپا بھی نرے پاپا ہی نکلے تھے کہ شفقت کے پردے میں یاسمین کی کیقدد تادیب تو کر گئے تھے لیکن یہاں اپنی ذات پر بھی گہری چٹکی لے گئے تھے۔

ابتو ہماری آزادی بھی زیر بحث آچکی تھی اور جب پتہ چلا تھا کہ وہ ہل اسٹیشن اپنی تمام تر رعنائیوں اور دلنوازیوں کے پس منظر میں حسن فروشوں کی ایک کمین گاہ تھا تو سخت شرمندگی دامنگیر ہوئی تھی لیکن ہمارا قصور کیا؟ ۔ اور پھر یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ اس الزام تراشی سے اس لڑکی کا مدعا کیا تھا اور ہم اس سر پھری لڑکی سے اس کے ڈیڈی کے روبرو ہی براہ راست کچھ بات پوچھنے پر مجبور ہوئے تھے۔

"کہیے مس یاسمین۔ آپ کو ایسا کیریکٹر پسند ہے جو کبھی پلیٹ فارم پر ہوتا ہے اور کبھی آپ کے روبرو" ہم نے اس کو جھنجھوڑا تھا لیکن مجھ سے اگر پوچھیے تو وہ ٹھوکر دل کا مستحق ہے"

اور ہم تیزی سے رخصت ہو گئے تھے اور وہ ذات محترم میری راہ پر حائل تھے۔

"یہ غلط طریقہ ہے۔ ناراض نہیں ہوتے، ناراضگی لڑکیوں کی صفت ہے۔ آپ کی نہیں" انہوں نے ہمیں بڑھ کر روک دیا تھا اور ان کی اس حرکت پر ہمیں زیر لب ہنسی بھی آرہی تھی۔ پھر تو انہوں نے جم کر سیر و سیاحت کے موضوع پر بحث چھیڑ دی تھی۔

۸

شہر یزداں :-

اور چونکہ ہم یونان میں تھے لہٰذا جہاں کہیں بھی گئے تھے ایک ایک بقراط اور افلاطون سے روشناس ہوئے تھے اور آنحضرت کسی بقراط اور افلاطون سے کم کیا ہو سکتے تھے بلکہ کچھ زیادہ ہی تھے جبکہ انہوں نے بھی یونان ہی کی مردم خیز سرزمین میں آنکھ کھولی تھی اور ان پر انیسویں اور بیسویں صدی کا مارکہ لگا ہوا تھا حضرت نے باقاعدہ سیر و سیاحت کے موضوع پر کسی یونانی فلسفی کی طرح طویل بحث چھیڑ دی تھی - اور پھر رفتہ رفتہ سیر و سیاحت سے چلکر انہوں نے ہمیں تاریخ اور پالیٹکس کے الجھیڑوں میں لا پھنسایا تھا - اور خاکم بدہن یہ غلط اصول تھا کہ حضرت اپنے علم و فضل سے خاکسار کو مرعوب کرنے کی کوشش فرما رہے تھے حالانکہ اپنے علم و فضل سے کسی کو مرعوب کرنا کوئی کریڈٹ کی بات نہیں تھی، اور جب پنجا نہیں دکھا سکے تھے تو ایک بھاری حربہ استعمال کر بیٹھے تھے یعنی کہ خاکسار

کو "الوہیت" کے میدان میں لا کھڑا کیا تھا، اس میدان میں انہیں یقین تھا کہ خاکسار کی شکست یقینی تھی۔ پھر تو سینٹ آگسٹائن کے لایزالی شہر کا تصور خاکسار کے سامنے طشت از بام کیا گیا تھا۔ حالانکہ تاریخ ایک جدا گانہ شے تھی لیکن حضرت سمجھانے کی کوشش فرما رہے تھے کہ مسیحیت نے تاریخ اور تاریخی شعور کو جنم دیا تھا چنانچہ عرض کرنا پڑا تھا۔ عالی حضرت اس میدان میں بفضلہ آپ کا کوئی حریف اور ہمسر نہیں اور کسی کی مجال نہیں کہ آپکے منہ آئے تاہم ایک گذارش ہے جو فی الحقیقت آپ ہی کی اصابت رائے اور فکر روشن سے مانگی ہوئی نظر آتی ہے، حالانکہ گذارش یہ ہے کہ درحقیقت مسیحیت نے تاریخ کے لئے محض "الوہیت" اور "ماورائیت" کا ایک ذہنی خاکہ پیش کیا تھا ورانحالیکہ وہ اپنی ذات میں ممیز اور ماوراتھی۔ پھر تو حقایق منکشفہ (REVEALED TRUTHS) کی مدد سے ایک تاریخی نظریہ کا استنباط ہمیں تاریخ کی دہلیز پر لا کھڑا نہیں کرتا۔ مسیحیت اٹھارہ سو برس تک ایک مسئلہ نظری "بنی رہی اور" الوہیت" کا تصور ایک ماورائیت کی نقاب اوڑھے رہا اور محض علم کلام تک محدود رہا چہ جائیکہ اسے بہ نفس نفیس زندگی کے میدان میں اترنا تھا۔ پھر روح القدس کی خطائے بشری کا کفارہ محض ایک زریں تصور بنا رہا حالانکہ یہ تاریخ کا ایک اہم جزو تھا اور اسے زندگی کے عین میدان میں ہونا چاہیئے تھا لیکن یہ بات کہاں تھی۔ بات تو تب ہی بنی تھی جبکہ علم انسانیت کا ایک ٹھوس علم مسیحیت کا ممد و معاون بنا تھا اور اسی کردار کی ہیروئن وہ تحریک تھی جو تاریخ میں "رینے سنس کی تحریک" کے نام سے مشہور ہے، اس تحریک نے دراصل

معاشرہ کا عقد ماحول سے کر دیا تھا۔ پھر اس اتصال سے ایک نئے معاشرے کا جنم ہوا تھا جو مسیحیت کی ایک ارتقا پذیر صورت تو ہو سکتی تھی لیکن وہ اس سے یکسر جداگانہ تھی۔ اور تاریخ شاہد ہے کہ تا وقتیکہ مسیحیت ماحول اور جغرافیہ کے براہ راست اختلاط میں نہیں آئی تھی اور ان کو متاثر نہیں کر سکی تھی اور پھر خود بھی ان سے متاثر نہ ہو سکی تھی ایک صحیح طاقت نہیں بن سکی تھی، چنانچہ معاف فرمائیں گے مسیحیت وہ نہیں جو عالی حضرت اپنی خوش فہمی کے عالم میں سمجھ رہے ہیں، اور یہ مسیحیت پر موقوف نہیں۔ درانحالیکہ اس قانون کی زد سے کوئی مذہب اور کوئی اصول خارج نہیں کہ ہر وہ معاشرہ جو جغرافیہ سے بے تعلق ہے معاشرت انسانی کے کام کا نہیں۔ آپ تو علم و فضل رکھتے ہیں، لیکن آپ کا وہ علم و فضل کس کام کا جبکہ اسکی کوئی جولانگاہ نہیں۔ آپ بڑے سرفروش سہی۔ لیکن آپ کی سرفروشی کس کام کی جبکہ آپ کا کوئی میدان نہیں۔ جسطرح مریخ کے کسی مشاہد کے لئے بھگر یا پلی اور مراکفن کی جنگ کچھ دور رس پہلو تو ضرور پیش کر سکتی ہے لیکن اس کا مشاہدہ ہمارے سیارۂ ارضی کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا درانحالیکہ یہ مشاہدہ اس سیارۂ ارضی کے مخصوص زمانی اور مکانی پہلو سے یکسر عاری ہے۔

بلاشبہ ہر عالم گیر مذہب ایک ارفع اور اعلےٰ نظام حیات ہے جس کی عظمت سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا باوجود اسکے کوئی تاریخ اور کوئی صحیفہ اس کی محض ایک ہنگامی تصویر پیش کر سکتا ہے جو اس کا ایک ہنگامی شعور ہے لیکن ایک زندۂ جاوید معاشرہ کی حیثیت سے وہ ارتقا پذیر ہے اور اس لحاظ سے پیہم تغیر پذیر ہے اور اس کی صورت

ہر لحظہ دگر گوں ہے۔ چنانچہ کسی ایک خاص دور میں اس کی کوئی تصویر ہر دور کے لئے مکمل نہیں۔ پھر یہ "رینے سنس" بذات خود کوئی شے نہیں بجز اس کے کہ وہ محض ایک لباس تھا۔ اور لباس بے جسم نہیں چنانچہ وہ لباس کسی جسم کی تلاش میں تھا اور وہ جسم اُسے معاشرۂ عیسوی میں ملا تھا، اور درحقیقت اس لباس کو تو اس نے اور تاریخ نے مل کر تیار کیا تھا۔ اور پھر کس قدر کراہیت کے ساتھ اس نے جو اسے زیب تن کیا تھا تو اس کے خدو خال میں بلا کی کشش اور جاذبیت آگئی تھی۔

حضرت کے ہم منہ کیا تکتے۔ یہاں تاریخ کے سنگلاخوں میں چلکر خود ہی پریشان ہوئے تھے، لیکن ڈر یہ لگا تھا کہ اب شاید ماری کھائیں گے چنانچہ ردِعمل دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن ردِعمل کچھ نظر نہیں آیا تھا۔ البتہ اس بکواس سے ان میں ایک شدید انقلاب یہ آیا تھا کہ موجودہ صحبت کو وہ بلا مبالغہ صحبتِ مے نوشی میں منتقل کرنا چاہتے تھے اور اس کارِ خیر کے لئے شراب منگالی گئی تھی، اور شراب کی ضرورت کیوں نہ ہوتی جبکہ باہر قیامت کی برفباری شروع ہو گئی تھی اور قہر کی سردی پڑنے لگی تھی، اور پھر اس صحبت کی رعایت سے اس سردی سے نپٹنا بھی ضروری تھا اور چونکہ شراب نوشی کے لئے کچھ ٹپ بھی درکار تھے لہذا تلی ہوئی مچھلیاں بھی آگئی تھیں، پھر یہ ساری چیزیں رفتہ رفتہ ٹیبل کی زینت بن گئی تھیں اور دیکھا تھا یہاں ٹیبل کی متنوع آرائش میں ایک اہم شے کا فقدان تھا جس کی طرف سے نہ جانے کسطرح عالی حضرت ہنوز غافل تھے جب بوتل کی ڈاٹ کھلی تھی تو پتہ چلا تھا ڈھالیس کس میں، درانحالیکہ مینا کے مصاحب جام کا ہونا

بھی ضروری تھا۔ پھر تو اس سہو پر کچھ فرمائشی قہقہے بلند ہوئے تھے۔ پھر تین نفیس و نازک آبگینے بھی آ گئے تھے۔ ہم نے اس ممنوعہ شے کے اس پر تکلف سلسلے سے احتراز کیا تھا۔ لیکن حضرت اس وقت فرشتے کی بات بھی نہیں مان سکتے تھے، پھر ہم کس گنتی میں تھے ایک دم نعرہ زن ہوئے تھے۔ "مے نوشی کتنی ہی بری شے کیوں نہ ہو لاریب زندہ دلی کی ایک دلیل ہے"۔ اور پھر میز کھسکا کر عین ہمارے آگے لے آئے تھے اور زبردستی نصف نصف آبگینے بھر دیئے تھے اور پھر آبگینہ سے آبگینہ ٹکراتے ہوئے حضرت نے ایک طرح سے اعلان کر دیا تھا کہ ہم "آل سکندر" تھے ہم نے یہ جانچنے کیلئے کہ آپ کس حد تک حق بجانب تھے۔ شراب کی ایک چسکی لی تھی اور غوطے لگانے لگے تھے تاریخ قدیم کے چند ابواب میں اور ان کی اتھاہ گہرائیوں میں گم ہو گئے تھے، لیکن ان کے اعلانیہ کی تصدیق نہیں کر سکے تھے۔ اس اثناء میں یاسمین نے بھی شراب کی ایک چسکی لیتے ہوئے اپنے شانوں کو اوپر کا ایک خفیف سا جھٹکا دیا تھا اور یہ حرکت یقیناً شراب کے گھونٹ کا ردعمل نہیں تھی بلکہ اس بات کا مظہر تھی کہ ہماری ساری غوطہ زنی بیکار رہی اور پھر واضح حرکات و سکنات سے بھی اس نے مزید ظاہر کر دیا تھا کہ وہ اپنے پاپا کے اعلانیہ سے قطعی متفق نہیں تھی۔ حالانکہ یہ اس کی اپنی حرکت تھی۔ لیکن یہاں اپنی ذات پر ایک چوٹ جیسی جمی تھی۔ اور ہاتھ شراب کی بوتل پر گیا تھا اور اس کے سر پہ تو خیر سے نہیں اس کے پیالے میں ہم نے انتقاماً شراب انڈیل دی تھی اور پیالہ بھر دیا تھا۔

"یہ ایٹی کیٹ نہیں!" یاسمین غصے میں ہونٹ کاٹنے لگی تھی۔

"یہ مجھے بھی معلوم ہے" ہم نے بھی اپنی زیادتی کو جائز قرار دیا تھا۔

"آپ کو کیا معلوم ہے؟" وہ غصے سے بے قابو ہو گئی تھی
"وہی جو تمہیں معلوم ہے" ہم نے بات ختم کر دی تھی۔
اور درحقیقت ہم آدابِ صحبت سے گندے ہو گئے تھے۔ لیکن یاسمین بھی آپے سے باہر ہو گئی تھی، مارے غصہ کے بل کھا گئی تھی۔ اور پیچ کھا گئی تھی۔ اور لب و لہجہ اسقدر غضبناک تھا کہ منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔ اور ہمیں ہنسی آ رہی تھی اور دل میں کہہ رہے تھے کوئی بات نہیں تم عادت سے مجبور تو ہم دل سے مجبور اور کچھ مضائقہ نہیں ہم تمہاری طرف سے لائقِ تعزیر ہی سہی لیکن بخدا ہم تمہاری الہڑ جوانی کو دعائیں دیتے ہیں کہ تم اور بگڑو اور ناراض ہو۔ تم ماہئ بے آب کی طرح تڑپو اور مرغِ بسمل کی طرح رقص کرو کیونکہ قہر و عتاب میں آئی ہوئی تمہاری یہ جوانی غضب کی جاذبِ نظر اور بلا کی حسین بن جاتی ہے لیکن فی سبیل اللہ مجھے تم اپنی جوانی کو سمجھا دو کیونکہ یہ مجھے سمجھ میں نہیں آتی۔ اور خدا کے لئے یہ بھی بتا دو کہ بات کیا ہوئی۔ اور تمہیں تکلیف کیا ہوئی۔ اور ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ آنحضرت نے شراب کا پیالہ خالی کر دیا تھا اور پیالہ کو مینر کے حوالے کرتے ہوئے کسی قدر مشفقانہ لہجے میں یاسمین کی تہدید کی تھی۔
"حالانکہ غصہ خاصۂ انسانی ہے تاہم یہ قطعی ٹھیک نہیں کہ اس کی مشق جا و بیجا کی جائے" حضرت نے یاسمین کو ملامت کی تھی اور پھر اس کے آگے سے انہوں نے شراب کا پیالہ اٹھا لیا تھا اور ایکدم میں ساری کی ساری شراب اپنے حلق میں انڈیل لی تھی اور پھر ہمارا شکریہ ادا کیا تھا۔ اور ادھر یاسمین کے تن بدن میں ایک

آگ سی لگ گئی تھی۔

"پاپا!۔آپ۔آپ کچھ نہیں سمجھتے!" یاسمین تقریباً چیخ پڑی تھی اور پھیر اس کی کرسی بھی پیچھے تھی اور وہ مارے غصہ کے سروقد کھڑی ہو گئی تھی۔

"میں ہی کچھ نہیں سمجھتا۔خیر خیر۔کوئی مضائقہ نہیں" پاپا نے ٹھنڈی سانس لی تھی۔

"یاسمین تمہیں اسقدر ناراض نہیں ہونا چاہیئے" ہم نے بھی اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"آپ خاموش رہیں۔آپ کی نصیحت کی اس وقت ضرورت نہیں!" اسے ہمیں خشمگیں لہجے میں جھڑک دیا تھا۔

"چہ خوب لیکن یہ تو بتا دو کہ آخر میری خطا کیا ہے؟" ہم نے اس سے وجہ دریافت کی تھی۔

"آپ اپنی خطا مجھ سے پوچھتے ہیں" وہ ایکدم تڑپ گئی تھی۔

"آپ لڑکیوں کو کیا سمجھتے ہیں؟"

"سمجھوں گا پھر کیا۔کچھ نہیں!" ہم نے مختصر جواب دیا تھا۔

"اور میں آپ جیسے جوانوں کو کیا سمجھتی ہوں؟۔کچھ نہیں!" وہ تقریباً چیخ گئی تھی۔

"پھر تو حساب برابر ہی رہا۔لہذا یہ غصہ بیکار ہے۔اور ادھر دیکھو تم کلی کی طرح مسکراؤ اور پھول کیطرح ہنسو، تم بیٹھ جاؤ اور مجھے

اجازت دو" اور ہم جانے کے لئے کھڑے ہو گئے تھے۔
"اجازت اپنے ان محترم سے مانگیے ہم سے نہیں" اسنے پاپا کی جانب اشارہ کر دیا تھا اور پھر کچھ سوچ کر اپنی کرسی پر بیٹھ گئی تھی، اور پاپا اس وقت یاسمین ہی کے پاپا نہیں تھے بلکہ ہمارے بھی پاپا بن گئے تھے۔ ہمارا منہ تک رہے تھے۔
"تو گویا آپ بھی ناراض ہوئے ہیں حالانکہ میں نے سمجھا تھا یاسمین ہی ناراض ہوئی ہے۔ اور دیکھئے یہ ادا عورتوں کو بھاتی ہے۔ آپ کو زیب نہیں دیتی ہے۔" اور حضرت نے اپنے ناتواں ہاتھوں سے کسی قدر طاقت کا مظاہرہ کیا تھا اور ہمیں بٹھا دیا تھا۔ پھر آپ نے یاسمین کی جانب بھی کسی قدر انگشت نمائی کر دی تھی اور اس دفعہ جو ہم نے یاسمین کی جانب آنکھ اٹھا کر دیکھا تھا تو اسے دیکھ نہیں سکے تھے کہ اسے ہم ابتک ایک خیرہ سر اور غیر سنجیدہ دوشیزہ سمجھ رہے تھے حالانکہ وہ اپنی پرسوز جوانی کی آمد کی ایک مکمل داستان بنی بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک چمک ہویدا تھی اور طنز جیسی ایک کیفیت جو بمشکل تبسم کہی جا سکتی تھی اس کے لب و رخسار پر مچل رہی تھی۔
"آپ دیکھ لیجئے حالانکہ یاسمین اب بچی نہیں تاہم وہ جاگتی رہتی ہے تا وقتیکہ میں جاگتا رہوں۔ اور یہ عادت اس کی بچپن کی پالی ہوئی ہے" حضرت نے مجھے متنبہ کر دیا تھا اور پھر اپنے پتلون کی جیب سے

سگریٹ نکال کر ایک اپنے ہونٹوں میں اٹکاتے ہوئے ایک اس جانب پیش کر دیا تھا۔

"اور ایک واقعہ یہاں برجستہ یاد آتا ہے....."، پھر انہوں نے سگریٹ سلگا کر ماچس اس جانب بڑھاتے ہوئے تلقین کی تھی۔

"سگریٹ پیو"

اور ہم نے سگریٹ سلگایا تھا کہ وہ برجستہ واقعہ ایک مسلسل داستان کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ آنحضرت اپنی زندگی کے اوراقِ پریشان سے اپنی فصیح و بلیغ فارسی میں کچھ ملاوٹ کی چاشنی کے ساتھ ایک خوں چکاں حکایتِ غم سنانے بیٹھ گئے تھے آپ جو کچھ فرما رہے تھے مجملاً یہ کہ آپ نے بلغاریہ سے ہجرت کی تھی۔ آپ کو اس سرزمین سے کسقدر محبت تھی اور کتنی الفت تھی اور آپ کس حسرت اور کس قلق کے ساتھ اس سرزمین سے نکلے تھے کہ آپ داستان کہہ رہے تھے اور الفاظ گلوگیر ہو رہے تھے اور یہاں اپنی سماعت اس کی تاب نہیں لا رہی تھی۔ آپ کہتے تھے آپ اس سرزمین کا تخلیہ کرتے جاتے تھے اور قدموں کو لغزشیں ہوتی تھیں اور ہر ہر گام پر یہ زمین ان کے قدم تھام تھام لیتی تھی۔ اس کے باغ و راغ اور گلزار و گلستاں ان کی راہ میں آتے تھے اور ان کا دامن پکڑ لیتے تھے۔ اس کے در و دیوار ان کی راہ میں حائل ہوتے تھے اور انہیں واسطے دیتے تھے اور ان کی منتیں کرتے تھے۔ اس کی گلیاں اور سڑکیں پیچ کھا کھا کر اور مچل مچل کر ان کی بلائیں لیتی تھیں اور انہیں روک روک لیتی تھیں۔ کسقدر دل شکن یہ منظر تھا کہ بے سہارا، بے کس، بے یار و مددگار،

بے مونس و غمخوار، جگر فگار، سینہ شق دلگیر اور دل برداشتہ، حسرتوں اور ارمانوں کی ایک دنیا دامن میں سمیٹے ہوئے فی امان اللہ ایک نازک سا سہارا میڈم کا ہاتھ ہاتھ میں تھامے اللہ بس باقی ہوس راہ طے کرتے جا رہے تھے۔ شب تاریک منزل دور، نشانِ راہ ناپید افتاں و خیزاں ایک انجانی منزل کی طرف چلے جا رہے تھے۔ وہ گھڑی بھی کیا گھڑی تھی کہ ایک سہانی صبح ناگاہ افق پر گرد و غبار کے کچھ آثار نمایاں ہوئے تھے جو آنے والے کسی طوفان کی پیشین گوئی کر رہے تھے اور دیکھتے دیکھتے وہ طوفان آگیا تھا، وہ انقلاب کا ایک طوفان تھا جو تیزی سے بلغاریہ کی سرزمین پر چھا گیا تھا اور آناً فاناً میں وہ سرزمین عرصۂ محشر اور میدان قیامت بن گئی تھی۔ پھر وہاں کون سے ایسے فتنے تھے جو اٹھ کھڑے نہیں ہوئے تھے۔ اور کون سے ایسے ہنگامے تھے جو برپا نہیں ہوئے تھے۔ کون سے ایسے جرائم تھے جن کا ارتکاب نہیں کیا گیا تھا، کونسے ایسے فضائل تھے جن پر دھبے نہیں لگائے گئے تھے، کونسے ایسے محاسن تھے جن پر داغ نہیں لگائے گئے تھے اور کونسے ایسے معائب تھے جنہیں فروغ نہیں دیا گیا تھا اور کونسی ایسی صداقتیں تھی جو جھٹلائی نہیں گئی تھی، ہزاروں گھرانے برباد ہوئے تھے اور لاکھوں انسان بے پناہ ہوئے تھے۔ کتنوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا، کتنوں کو تاراج و برباد کیا گیا تھا۔ کتنوں کی عزت و ثروت لوٹ لی گئی تھی، کتنوں کے دامن عصمت چاک کئے گئے تھے، کتنے رئیس کج کلاہ فقیرِ بے نوا ہوئے تھے۔ کتنے گدائے رہ نشیں مسند پر جا بیٹھے تھے، کتنے فاضلِ دین اور صاحبِ یقین

شہر بدر کئے گئے تھے، اور کتنے صوفی صافی خدارسیدہ بزرگان دین
قافلہ در قافلہ ترک وطن پر مجبور ہوئے تھے۔ اور کتنے اوباش آوارہ اور
رذیل صاحب ثروت بنے تھے۔ کتنے اکھڑ بدمعاش لفنگے اور شہدے
صاحب اقتدار بنے تھے اور کتنے نیچ کمینے اور ذلیل صاحب تدبر بنے
تھے۔ یہ انقلاب کی حشر سامانیاں تھیں اور آپ اس میدان حشر سے
خونخوار انسانی درندوں کے بیچ سے اپنا نام و ننگ لے کر زندگی کی اس
کٹھن سفر میں نکل پڑے تھے۔ تشنہ کام، خشک زباں، بے آب و ناں،
اور بے سر و ساماں آپ چلے جا رہے تھے اور چلتے چلتے ایک دن ناگاہ یونان
کی سرزمین میں وارد ہوئے تھے۔ اور رحمت حق کو اک بیک حرکت ہوئی
تھی اور ایک بیک آپ کی ساری مشکلیں آسان ہو گئی تھیں، اس مہر ورقت
کی سرزمین نے بڑھ کر آپ کو سینے سے لگا لیا تھا اور اس نے ہمیشہ کے لئے آپ کو
اپنے دامن میں پناہ دی تھی۔

آپ یہ دردناک داستان کہتے جاتے تھے اور ہم اور یاسین سامعین
کی حیثیت سے دل تھام کر داستان سنتے جاتے تھے اور ہماری نگاہیں خود
بخود پر نم ہوئی جاتی تھیں۔ طرز تکلم اور انداز تخاطب سخت ڈرامائی تھا اور
سماعت کا دامن ہاتھوں سے چھوٹ چھوٹ جاتا تھا۔ اور خدا خدا کر کے
داستان ختم ہوئی تھی اور ایک سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ اور پھر آپ نے یہ
کہہ کر قطع کلام کیا تھا کہ یہ سارا حادثہ ایک تاریخی عمل تھا اور تاریخ نے شکنجۂ
روزگار میں جکڑ کر آپ کو جس قدر مجروح کرنے کی کوشش کی تھی آپ کی

شخصیت اور انفرادیت اُسی شدت سے ابھری تھی۔ اس وقت رات کافی آچکی تھی اور رات کے اس آخری پہر میں سردی اپنی معراج کو پہونچ چکی تھی اور اب اس شدت کی سردی میں بیٹھنا مشکل ہو رہا تھا چنانچہ ایک نہایت تیز شراب کا سہارا لیا گیا تھا۔ اور یہ ان کی خانہ ساز شراب "جن" تھی جو بقول ان کے انکے اپنے یہاں کے کچھ کیمیائی اجزا سے تیار کی گئی تھی جو درحقیقت تمام بازاری جنوں سے کہیں زیادہ پاکیزہ اور تیز تھی اور یہاں اس کے چند جرعے حلق میں اتار کر ہم بیٹھے تھے لیکن قدم فلک الافلاک کی سیر کر رہے تھے اور ہر ہر نقش قدم پر لالہ و گل کھل رہے تھے۔ اور ادھر ہم ایک دوسری داستان سن رہے تھے جو پہلی کی طرح المیہ نہیں بلکہ ایک طربیہ داستان تھی اور وہ داستان مشتمل تھی ان واقعات پر جو انپر پچیس سال تک ایران میں گذرے تھے اس وقت سماعت بھی کسی قدر ساتھ دے رہی تھی۔ حضرت سرگذشت سناتے جاتے تھے اور باہر سڑک سے آوارہ کتوں کے بھونکنے کی آواز بیچ بیچ میں خلل انداز ہوتی تھی۔ وہ کتے خاص کر اس وقت بھونکتے تھے جب کوئی شے سڑک سے گذرتی تھی یا پھر شراب کے نشے میں چور کسی یونانی سولجر کے پھٹے ہوئے بوٹ اور پھٹے ہوئے اور کوٹ کو دیکھ کر خود بخود بھونکنے پر مجبور ہوتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی سولجر نشے میں جھومتا اور اٹھکھیلیاں کرتا ہوا دروازے پر آن رکتا تھا اور بے باک نگاہوں سے ہم لوگوں کو گھورتا تھا۔ کبھی کچھ فقرے چُست کرتا تھا۔ اور کبھی یاسمین کو گھورتا تھا۔ اور باوجود اس کے کہ یہ حرکت حد درجہ ناشائستہ

تھی لیکن ان کے حال پر غصہ کے بجائے رحم آتا تھا اور سوچتے تھے کہ ایسی ناشائستہ حرکت کسی ہندوستانی یا انگریزی سولجر سے کبھی سرزد نہیں ہو سکتی تھی یہ اس لحاظ سے نہیں کہ یہ بات انہیں آتی نہیں تھی بلکہ اس لئے کہ وہ یہاں کچھ کردار ساتھ لائے تھے اور اپنے سامنے ایک مشن رکھتے تھے۔

اور چونکہ ہم یورپین تھے اور وہاں کتے پالنا شرافت کی ایک نشانی تھی چنانچہ کسی گھرانے کی عظمت کا اندازہ اس بات سے نہیں لگایا جا سکتا تھا کہ اس میں کتنے افراد ہیں بلکہ اس امر سے کہ اس نے کتنے کتے پال رکھے ہیں۔ لہذا شرافت کی سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ کتے پالے جائیں اور اس گھرانے کو شرافت کی خلعت عطا ہی نہیں کی جا سکتی تھی جس نے دو چار کتے نہیں پال رکھے ہوں۔ لہذا ہمارے اعلیحضرت نے بھی دو کتے پال رکھے تھے۔ اور وہ کتے بھی عام کتوں ہی کی طرح تھے جو شراب کے ٹیبل سے لے کر دکان کی کاونٹر تک اور ڈرائنگ روم کے صوفوں کرسیوں میزوں اور حتیٰ کے درون خانہ کے بستر اور پلنگوں تک کو اپنی جولانگاہ بنائے ہوئے تھے، ایک چھوٹے سائز کے "آئرش"، کتے کی اس قدر ناز برداری کی جاتی تھی کہ وہ دو دفعہ تو ہماری موجودگی میں شراب کے ٹیبل پر گول ہو چکا تھا اور کبھی کبھی شراب کے آبگینوں کو بھی چاٹتا تھا اور پھر اعلیحضرت کا یا پھر یاسمین کا منہ چاٹتا تھا اور پھر یہ چاٹنا واٹنا اس کی وفاداری کی دلیل کہی جاتی تھی۔ اس کتے نے تو دو دفعہ اس جانب بھی اپنے لعابِ دہن کے بوسوں سے ہمارے کام و دہن کی تواضع کرنے کی کوشش کی تھی

لیکن اسے ہم نے بڑے پیار سے باز رکھا تھا اور اسے سمجھا دیا تھا کہ محبت میں عجلت اچھی چیز نہیں اور وہ کافی سمجھ دار تھا کہ اسے مزید پیش دستی نہیں کی تھی۔ اور چونکہ وہ اور دوسرا کتا آخر کتے ہی تھے اور انہیں چیلانا اور بھونکنا آتا تھا لہذا وہ یا تو شراب کی میز سے یا پھر دواؤں کے کاونٹر پر سے اچھلتے اور ان جھومتے ہوئے بدمستوں کی خبر لیتے اور اگرچہ وہ پالتو کتے تھے اور انسان کی صحبت میں انسان کی طرح مدتوں سے پلتے چلے آئے تھے لیکن انہیں ہنوز اس بات کی تمیز نہیں آئی تھی کہ زیادہ شراب پیکر کوئی یونانی سولجر نہیں بلکے ہنیں جھومے نہیں لہرائے تو اور کیا کرے۔ اور وہ جھپٹ پڑتے تھے ان پر اور ان کو دُور دُور تک لد اتنہ دکھا آتے تھے۔

اور یہاں حضرت عالی کی شیریں مقالی اور معجز بیانی پر ہدیۂ دل پیش کرنے کو جی چاہتا تھا کہ کیا طرزِ تکلم پائی تھی اور کیا اندازِ تخاطب اپنایا تھا۔ حضرت کسی باکمال فنکار کی طرح گویا اپنی زندگی کے ڈرامے کی ریہرسل کر رہے تھے۔ اور ہم سامعین کی حیثیت سے دلچسپی لے رہے تھے۔ اور سنتے سنتے تھک گئے تھے۔ ذراسی اکتاہٹ ظاہر کی کہ شیشے میں شراب انڈیل دی جاتی تھی یا پھر سگریٹ پیش کر دیا جاتا تھا۔ اور ہم بے خوابی کے عالم میں شراب کے جرعے چڑھا چڑھا کر اور سگریٹ کے دھوئیں پھونک پھونک کر بہک نہیں رہے تھے بلکہ حیران ہو رہے تھے کہ ہماری اس شب کی سحر کب ہوگی۔ درانحالیکہ داستان گو کے لئے ہنوز وہی شامِ فراق تھی۔ قصہ غم فضول تفصیل اور مبالغہ کی وجہ سے بے حد طول پکڑتا جا رہا تھا۔ اور اکثر یا ان کی داستان ہماری

سماعت سے اتر اتر جاتی تھی کیونکہ اس وقت ہم دعائیں کرتے ہوتے تھے اور ہم نے منتیں مان مان کر اور دعائیں کر کر کے بدقت تمام اس صحبت سے گلو خلاصی حاصل کر لی تھی۔ گھڑی پر نظر پڑی تھی تو مقررہ چار بج چکے تھے، اور سحر ہوا ہی چاہتی تھی، پھر ہم نے دعائے مغفرت کی تھی اس داستان گوئی کے حق میں کہ حضرت نے ایک نگاہِ غلط انداز میرے چہرے پر ڈالی تھی اور گویا اپنی ترچھی ترچھی نگاہوں سے ہماری طبیعت کا کچھ اندازہ لگا لیا تھا اور برجستہ فرما دیا تھا۔

"اور شراب منگاؤں؟"

گویا اب بھی کسر باقی رہ گئی تھی۔ سخت حیران ہوئے تھے کہ اس پیری اور سالخوردی کے عالم میں مے نوشی کی یہ لت کہ ساری رات پیتے رہے ہیں اور سحر کو خدا کا نام نہیں۔ طبیعت ہنوز سیر نہیں ہوئی تھی۔ پوچھا جا رہا تھا "اور شراب منگاؤں"۔ استغفر اللہ!۔ اور ہمیں حیرت تھی کہ اس شوخ لڑکی کے صبر و تحمل کا پیمانہ کس قدر وسیع تھا کہ اس کامل شب بیداری کے عالم میں اس کی جبیں پر شکن تک نہیں آئی تھی، اور یہاں مقررہ بغاوت کا علم بلند کر چکے تھے کہ ہم ایکدم رخصت ہو گئے تھے اور پتہ چلا تھا یاسمین کا بھی صبر کا پیمانہ چھلک گیا تھا کیونکہ سرگوشی کے انداز میں اس کے لبوں سے نکلی ہوئی صدائیں کچھ احتجاجی صدائیں تھیں جو ہمارے کانوں میں سمائی تھیں۔ "ان کی عادت ہی ایسی ہے" اور ہم اس اطلاع سے اور چونکے تھے اور جلدی جلدی بھاگ نکلے تھے کہ پھر مصیبت آگئی تھی۔ عقب سے آواز آئی تھی اور ہمیں یہ خدشہ لاحق ہونے لگا تھا کہ

حضرت کو اب یاد پڑی ہے کہ کوئی تیسری داستان چھوٹ رہی ہے جو سماعت نواز ہونا چاہتی ہے اور خاکسار کے پاس مفت کا وقت ہے اور مفت کا دماغ ہے لہٰذا افسانے کے لئے لوٹایا جارہا ہے۔ حیران تھے کہ اس سحر کی شب کیونکر ہوگی اور دفتر میں ایمان کے رہزنوں کو کیا جواب دیں گے کہ اک بیک دعا قبول ہوگئی تھی اور اس گنہ گار کو بخش دیا گیا تھا۔ لیکن بڑے بجل سے۔ حضرت نے فرمایا تھا۔

"میں چشم براہ ہونگا۔ اگر تم شام کو نہیں آئے!" مطلب یہ تھا کہ ہم اگر جانا چاہیں تو جا سکتے ہیں اور اگر جائیں نہیں تو شام کو پھر آ کس طرح سکتے ہیں، چنانچہ فقرہ کو غور کر لیا تھا کہ اس سے جانے کا مفہوم نکلتا ہے۔ اور پھر یاد آرہا تھا کہ حضرت ابھی ابھی ہماری ایک شام کا سویرا کر چکے ہیں اور پھر دیدہ و دل فرش راہ یہ ہماری اگلی شام کے لئے عرض کر دیا تھا۔

"یہ سراسر زیادتی ہے، میں شام کو ضرور آؤں گا"

اور جلدی جلدی فرار ہو گئے تھے اور تبھی جان میں جان آئی تھی جب عقب سے آنے والی صداؤں کی زد سے نکل گئے تھے۔

عالی حضرت کا نیک نام مسٹر ریچرڈ تھا۔ اور یہ بڑے براہ راست قسم کے آدمی تھے لیکن جھوٹے دانت لگا رکھے تھے اور بڑھاپے کی آخری منزل طے کر رہے تھے باوجود اس کے آپ کے وضع و انداز میں بلا کی جاذبی تھی اور غضب کی دلکشی تھی اور کیوں نہ ہو جبکہ آپ ایک الٹرا موڈرن جنٹلمین تھے۔ اُنیسویں صدی کے آخر میں پیدا ہوئے تھے اور اس وقت بیسویں صدی میں فردکش تھے۔ برف پیری

سر پر جھکی تھی۔ زمانے کے بیشتر سرد گرم دیکھے تھے اور گردشِ دوراں کی کئی ہی داستانیں انہیں ازبر تھیں اور وہ ان تمام اوصافِ جامعہ و کاملہ سے متصف تھے جو ایک بیدار دل انسان میں اس عمر میں ان دیئے گئے احوال میں خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں اور ہمیں بغداد کے خلیفہ ہارون رشید کا زمانہ یاد آرہا تھا کہ دنیا کے اس دور میں اب بھی ایسے برگزیدہ اور فرشتہ صفت انسان نظر آجاتے ہیں جو کسی کے لئے خواہ مخواہ کیا کیا کچھ نہیں کریں گے۔ وہ عنایات اور لطف و کرم کی بارش سا کر دیں گے اور نوازشات کے دریا بہا دینگے، اور انسان نوازی کے جذبے میں آ آپ پر سو جانوں سے مر مٹیں گے تو بھی ان کے دل کو تشفی نہیں اور روح کو تسکین نہیں۔ آپ ہیں کہ ان سے کترا رہے ہیں بھاگ رہے ہیں اور وہ سب کچھ سمجھ رہے ہیں اور آپ کا پیچھا کر رہے ہیں اور آپ کی منیتں کر رہے ہیں آپ دنگ ہیں حیران ہیں اور پریشان ہیں بھلا اس پاگل پن کا کیا جواب ہے نہ آپ ان کے کوئی لگتے نہ آپ کی ذات سے ان کی کوئی غرض اور نہ کچھ غایت پھر کیا وجہ ہے کہ وہ آپ پر اس قدر مہربان ہو رہے ہیں اور آپ کے لیے اور علی ہذا القیاس اپنے لئے اسقدر تضیع اوقات کا سبب ہو رہے ہیں کہ کچھ نہ کہا جائے۔ انسان نوازی کی حد ہوتی ہے۔ اظہار محبت کے لئے کون سے ایسے جتن ہیں کہ نہ کئے ہوں۔ اس ابن السبیل کے لئے منتظر ہیں، چشم براہ ہیں، ایک بے چینی اور بے کلی لاحق ہے۔ عقل حیران تھی اور سمجھنے سے قاصر تھی کہ ماجرا کیا ہے اور خالصتہ للّٰلہ یہاں خالص خلق کریمی اور لطفِ عمیمی کا ایک مظاہرہ تھا کہ ایک دن قضاء ایم پکڑے گئے تھے اور ایک آراستہ و پیراستہ مرصع ہال میں ناحق

ڈھکیلے جارہے تھے۔ ایک ناتواں ہاتھ اپنے عمل میں دیرینہ مستعدی اور مستحکمی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ کوشش اور کاوشں کا مدعا اور ماحصل یہ تھا کہ ہم اندر چلکر صوفہ نشیں ہو جائیں اور اس دلِ ناتواں کو ایک گونہ تسلی ہوئی تھی جب یہ خدشہ جاتا رہا تھا کہ ہم اب مکمل طور سے الجھائے گئے ہیں اور ہمارے ہاتھوں سے آنکھ بچا کر نکل جانے کے سارے مواقع نکل چکے ہیں، باہر کی کٹتی اور چبھتی ہوئی برفانی ہواؤں سے جب پر تکلف ہال کی گرم و معطر فضا میں قدم رکھا تھا تو سردی سے ٹھٹھرے اور شل ہوئے جسم میں کمرے کی حرارت نے نئے سر سے جان ڈال دی تھی۔ ہال کیا تھا؟ طرز آرائش اور ذوقِ لطافت کا ایک حسین مرقع اور مغربی شعورِ زندگی کا جدید ترین نمونہ تھا۔ لینولین کے فرش پر قیمتی قالین کی آرائش فیروزہ رنگ کی چمکتی ہوئی وسیع اور دبیز مسدس میز جس کا ایک گوشہ بڑھ کر ایک جانب ایک خوشنما دریچے پر مڑتا تھا اور ایک پر منظر پھلواری میں جھانکتا تھا۔ بنی بانہہ کی کرسیاں، قیمتی فوم کشن اور صوفوں کی پر آسایش لچکدار سیٹیں، دروازوں پر ہلکے آسمانی رنگ کے زاویہ ساز حریری پردے، نیم برہنہ دریچوں پر خوشنما پھول کے گلدستے، ڈیزل سے جلتی ہوئی پائپ کی انگیٹھی ایک جانب دیوار سے لگی ہوئی ہال کی زمہریری اور یخ بستہ فضا کو گرم و سازگار اور بے حد خوشگوار بنا رہی تھی۔ ادھر مرکری لیمپ کی روشنی میں جگمگاتا ہوا ہال فردوس کا ٹکڑا بنا ہوا تھا، خاطر تواضع کچھ اس انداز سے کی گئی تھی کہ اس باب میں اسی قدر غرض ہے کہ پینتالیسؔ صدی قبل کا ایک مہمان سراپا دار رہا تھا۔ جہاں الا صدقی وسوز کفر و اِسکار کا کوئی مقام نہیں تھا اور

مہمان سے سوائے لطف و کرم کے کج خلقی کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ اور فطرت سے مجبور کرتے تو کیا کرتے جبکہ ان کی تخلیق ہی اس خلقِ کریمی اور لطفِ عمیمی کی خمیر میں ہوئی تھی کہ وہ بحت لاچار تھے اور یک قلم معذور رکھتے کہ وجہ نہیں تو بلا وجہ ہی سہی آپ پر نوازش اور لطف و کرم کرنے پر مجبور ہیں، اور حد یہ ہے کہ اپنی سعی مالا کلام سے ایک شمہ برابر ثابت نہیں ہونے دیں گے کہ آپ کسی کے لطف و کرم کا شکار ہو رہے ہیں۔ کیا طور ہیں، کیا انداز ہے۔ کیا اخلاق ہے اور کیا سیرت ہے۔ جھنجھلا جانا، چیں بہ جبیں ہو جانا بالکل ہی نہیں جانتے۔ مزاج ہے کہ سدا شگفتہ پھول ہے ہنستا ہوا قہقہہ لگاتا ہوا۔ اور یہ ایک سبق کی طرح انہیں یاد تھا ان کی زندگی ہے کہ مسرتِ ازلی کا ایک ابدی سلسلہ ہے جو منقطع نہیں ہوتا، گویا سرور انبساط کا ایک پیہم رواں سرچشمہ ہے جو کوہ و وادی و چمن سے سدا مدھر گیت گاتا ہوا سبزہ و گل سے اٹھکیلیاں کرتا ہوا سخت اور کھٹور چٹانوں کے قلب و جگر کو برماتا ہوا گذرتا جا رہا ہو ——— یہ مقرر شان کریمی کی ایک تیز جھلک تھی جو برق کی طرح کوندی تھی اور آندھی بن کر ہماری زندگی میں چھا گئی تھی اور سیرت کی ایک گرمی حرارت نے اس برفستانی اور زمہریری فضاؤں میں ہمیں ٹھٹھرنے سے اماں دی تھی۔

اور من و دست و دامانِ آل رسول۔ مہمان سرائے خلیل اور ابن السبیل کا واقعہ شدت سے یاد آتا تھا، مگر اس دی گئی حالت میں ہم کچھ ایسے ابن السبیل تھے کہ لطف و کرم کے خاص مستحق بنائے گئے تھے مگر اس کے باوجود صحیح حالت اپنی یہ تھی کہ حضرت کی دختر نیک اختر کی طرف سے ہمارا پیہم امتحان لیا جاتا تھا۔

خوبصورت سے خوبصورت پیرائے میں اور لطیف سے لطیف انداز میں سنگیں سے سنگین تنقیدیں کی جاتی تھیں۔ مثلاً یہ کہ ان کی فیملی میں مجھے "رکنِ خاص" کا درجہ حاصل تھا۔ اور پھر خلوص کے تموج کے نیچے بحر کی تہ سے کچھ خلاف توقع چیز کے اچھلنے کا امکان تھا۔ اور استغفر اللہ شاہدانِ بے شہادت سے مجھے "فیضانِ روحانی" کی توقع تھی یعنی مختصر یہ کہ ہم متفرق اور متضاد صفتوں سے متصف ایک انسان تھے۔ سخت تنگ آئے تھے، تہمت تراشی اور آئے دن کی افترا پردازیوں سے۔ کوئی دن ایسا نہیں گذرتا تھا کہ کوئی نیا فردِ جرم ہماری گردن پر حمایل نہ کر دیا گیا ہو۔ اور تماشا نہ دیکھا گیا ہو۔ شہر کا جانا بھی ترک نہیں کر سکتے تھے درآنحالیکہ ہماری گذرگاہ شہر ہو کر ہی جاتی تھی۔ سیدھی سڑک سے منحرف ہو کر کسی تنگ گلی کوچے سے آنکھ بچا کر نکل جانا بھی مشکل تھا کہ پیرِ محترم ہماری ساری گذرگاہ حتیٰ کہ گذرگاہِ خیال تک پر حاوی نظر آتے تھے۔ اور استطاعت کہاں کہ ان سے بیرخی کر سکتے تھے۔ ہم اپنے دل پر پتھر رکھ لے سکتے تھے لیکن ان کی دل شکنی نہیں کر سکتے تھے۔ کہ وہ مستقل میزبان اور ہم علی الاطلاق ویسے ہی مہمان واقع ہوئے تھے۔

۹۔

ناکردہ گناہ :۔

کچھ ناکردہ گناہوں کے باب میں المختصر اینکہ ایک دن حسب معمول
اقوام متحدہ کے پھرسے بسانے والے دفتر پہ اپنے کسی فریض کی انجام دہی کے
سلسلے میں گئے تھے اور اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو کر لوٹ رہے تھے کہ
حضرت محترم ہماری راہ پہ دیوار چین بن کر کھڑے تھے اور ہماری پیشقدمی محال
تھی۔ احتیاطاً مجھے بتایا گیا تھا یوں کوئی رکاوٹ نہیں اور ہم بخوشی چلے جائیں
لیکن صرف ایک کپ کافی نوش کرتے جائیں۔ اور اس اخلاص و محبت کے صدقے
یہاں کافی وقت ہمارا ضائع کیا گیا تھا جب کے چلتے ہمیں باقاعدہ جواب دہی
دینی پڑی تھی۔ اور کتنی ہی دفعہ ہماری بازپرس ہو چکی تھی۔ اور صداقت کا
دامن چھوڑ ہم دروغ گوئی کا سہارا کسی حالت میں بھی نہیں لے سکتے تھے چنانچہ
بازپرس کے میدان میں ہمیں سدا سربکف رہنا پڑتا تھا۔ اور مصیبت یہ تھی کہ لاکھ

آنکھیں بچاتے تھے اور لاکھ احتیاط سے کام لیتے تھے لیکن حضرت کے جذبۂ لطف و کرم اور اخلاص و محبت کے طوفانی تھپیڑوں میں گھر جاتے تھے اور ہمارا دم گھٹنے لگتا تھا اور شناوری کے جوہر دکھا جس قدر جلد فرار ہونے کی کوشش کرتے تھے اسی قدر اور اُلجھائے جاتے تھے۔ اور نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ہمارا قیمتی وقت ہمیشہ ضائع ہوتا تھا۔ اور کبھی تو اہم سے اہم فرائض سے پہلو تہی کرنا پڑتا تھا۔ لیکن ہم کرتے تو کیا کرتے جبکہ ایک برتر طاقت ہمیں پابہ زنجیر کئے ہوئے تھی اور آئے دن سرِ راہ پکڑے جانا ایک معمول سا ہو چلا تھا اور ہم چون و چرا نہیں کرسکتے تھے۔ اور حرفِ شکایت تو زبان پر لا ہی نہیں سکتے تھے۔ اور ہم جو پکڑ دھکڑ کر خانۂ پرتکلف میں ایک کپ کافی کے سلسلۂ ضیافت میں بند داخل ہوئے تھے تو اس میں دخل تھا ان کی بے پناہ محبت کو جس میں کافی محض ایک بہانہ تھی۔ ہم نے دہلیز میں جو قدم رکھا تھا تو کچھ مکھڑوں پر تبسم کی لکیریں اور خندہ پیشانی کی جھلکیاں تھیں اور کسی نے تو ہمارا خیر مقدم تبسم پنہاں کے پردوں میں چیں بہ جبیں ہو کر کیا تھا۔ اور ان کی نظر میں ہم مہمان نہیں تھے بلکہ ایک "رکنِ خانہ" تھے۔ چنانچہ انہوں نے مزاج پرسی کے بجائے مزاج کا امتحان لیا تھا۔

"آج ورکنگ ڈے ہے نا؟" اک گونہ سرگرانی کے عالم میں ہم سے سوال کیا گیا تھا۔ سرگرانی کی وجہ ہمیں معلوم نہیں تھی پر معلوم تھا کہ اس دن "ورکنگ ڈے" تھا۔

"بے شک اور لاریب آج "ورکنگ ڈے ہے" چنانچہ ہم نے یہی جواب دیا تھا۔

"اور یہ اس وقت کدھر کی سیر سے آنا ہوا؟" پھر دوسرا سوال کیا گیا تھا۔ اور ظاہر تھا وہ وقت سیر کا نہیں تھا پھر اس کا ہم جواب کیا دیتے۔

"سیر سے تو نہیں، اسلئے کہ یہ سیر کا وقت نہیں"، ہمیں عرض کرنا پڑا تھا "البتہ ہم ڈیوٹی سے آرہے ہیں کیونکہ ڈیوٹی ہمیں ہمیشہ عزیز ہوتی ہے" لفظ "ڈیوٹی" کا وزن جانچا گیا تھا اور کسی قدر قرات کشش اور تلفظ کے ساتھ اس لفظ کو زبان سے ادا کیا گیا تھا۔

"اس اقوام متحدہ نے یہاں بہت کام کیا ہے نا؟"، ہم سے مزید سوال کیا گیا تھا۔

اور یہاں بحث خالص متنازعہ فیہ پالیٹکس کی حدوں کو چھو رہی تھی چنانچہ پاپا نے شفقت کے پردے میں کسی قدر تادیب کی تھی۔ "یاسمین۔ پلیز۔ یہ بحث پھر بھی چھیڑ سکتی ہے۔ ذرا دیکھنا کافی میں دیر کیوں ہوئی۔ پلیز۔ حضرت یاسمین سے کسی قدر ڈرتے بھی تھے۔ اور ادھر کافی خود بخود آگئی تھی اور ہم لوگوں نے کافی پی تھی۔ پھر ہم اقوام متحدہ کے رول پر غور کر رہے تھے جو ان ملکوں میں وہ ادا کر رہی تھی کہ اک بارگی ہمارے غور و فکر کا سلسلہ کاٹ دیا گیا تھا اور ہمیں کسی قدر سنجیدگی کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

"ایک بات کہوں"، یاسمین نے کہا تھا۔ "یہ جو عالمِ آزاد (فری ورلڈ) سے کچھ خوش فکر اور خوش پوش نوجوان یہاں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں ان کی حرکات و سکنات ہمیں قطعی پسند نہیں۔ ان کے افعال سے

ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے ساتھ اس عالم آزاد سے تعمیری کاموں کا کوئی ٹھوس پروگرام نہیں لائے ہیں۔"

ہمیں اس الزام کی صحت پر کلام تھا اور یہ تو درحقیقت ہمارے پھر سے بسانے والے محکمہ کی ساری مساعی پر سر دیا پانی پھیر دینے کے مرادف تھا اور یہ جاننے کی اہم ضرورت پیش آگئی تھی کہ یہ صدائیں اس سرزمین کے کن کن گوشوں سے بلند ہوتی ہیں ہمیں اب احتیاط کے ساتھ بات کرنی پڑی تھی۔

"آپ کو ہم لوگ پسند نہیں یہ اور بات ہے" ہم نے فوراً مخالفت کی تھی۔ "لیکن یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ ہمارے تعمیری مشن سے آپ کے ملک کو بہت کچھ فائدہ پہونچا ہے لیکن کیا آپ بلا کسی ذہنی تحفظ کے بتا سکتی ہیں کہ یہ خیال آپ کا ایک منفرد خیال ہے"

"فائدہ اور نقصان کی بات کیسی جناب من" اس نے اسی تیقن سے جواب دیا تھا۔ "ہم تو اس پالیٹکس پر غور کرتے ہیں اور ہمیں سخت خطرہ نظر آتا ہے کہ دراصل عالم آزاد یہاں استعانت کے پردوں میں اپنے کیمپ میں کچھ ملکوں کو گھسیٹنا چاہتا ہے تاکہ استعماریت کے پنجۂ خونیں کی جکڑ دنیا کی نحیف و نزار قوموں پر کچھ دنوں تک مضبوط رہے"

پھر یاسمین کسی قدر خاموش ہوئی تھی اور اس نے اپنے برانگیختہ جذبات کو کسی قدر ساکن کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن جذبات بے قابو تھے۔

"دیکھئے مسٹر" اس نے پھر پورشی کی تھی۔ "آپ نے ابھی ابھی پسند کی بات کہی۔ نا۔ اس میں پسند کا کیا سوال ہے۔ ہم تو عالم آزاد کی کار گذاریوں کو دیکھتے ہیں اور غایر نظر سے اس کی بے لسبی کا مطالعہ کرتے ہیں اور ہمیں ہنسی آتی ہے طریق کار پر۔ آپ کی سرکار کمیونزم سے ڈرتی ہے اور اس کی طوفانی طاقتوں کو روکنے میں اس کے حواس ٹھکانے نہیں عقل سلامت رہے اس نے اس جنگ سے تباہ حال ملک میں پھر سے بسانے کا مسئلہ چھیڑ کر نئے نئے اور بھاری بھاری مسائل پیدا کر دیئے ہیں جو نہایت دور رس ہیں اور سیاسی اور اقتصادی نکتہ نظر سے ایک طویل بحث کے متقاضی ہیں، اس کی سیاسی و اقتصادی استعانت اور بداخلت سراسر ہماری قومی توہین ہے جسے تاریخ کبھی معاف نہیں کر سکتی۔ اس سرکار نے فری ورلڈ کے گوشے گوشے سے پکڑ پکڑ کر یہاں کچھ ایسے البیلے جوانوں کی درآمد کی ہے جو دوسروں کے ملک میں کس آزادی سے ڈیوٹی کی دہائی دیے کر کس جبرہ دستی سے اخلاق سوز کارنامے انجام دے رہے ہیں۔ کچھ ازل کے مجنوں ہیں، جن کا کوئی کام نہیں سوا اسکے کہ اس ملک کے گوشے اور چپے چپے میں عشق" کی آگ لگاتے پھرتے ہیں۔ چلتے پھرتے اور اٹھتے بیٹھتے عشق کے نعرے لگاتے رہتے ہیں اور رومیو جولیٹ کے صدق و سوز کا واسطہ دیتے رہتے ہیں۔ اور ان سے پوچھئے عشق کس چڑیا کا نام ہے تو ظاہر ہے کہ نہیں جانتے۔ طبیعت میں تو کبھی کبھی آتا ہے کہ

میں ان کا عشق ایک ہی دفعہ ٹھنڈا کر دوں "

اب ہمارے حواس بجا ہوئے تھے کہ یاسمین کی جارحیت اسقدر رنگین نہیں جتنا کی ہم توقع کر بیٹھے تھے۔ ہم نے کسی قدر اطمینان کا سانس لیا تھا۔

"کیوں نہیں، کیوں نہیں۔ آپ دستِ شفا ہیں آپ ایک ہی جھاڑ میں ان کے عشق کے سارے امراض دفع کر سکتی ہیں" ہم نے ان کی تائید کی تھی "لیکن یہ نامراد اس مرض کی شفائے کلی کبھی نہیں چاہتے اور آپ دیکھ لیجئے آگ سے کھیلنا اس گروہ کا کام ٹھہرا۔ اس آتشِ خفتہ کو کرید کرید کرے آئے اور لیتے ہوئے یہاں تک پہونچے۔ اور اس بات میں میں آپ کا ہمنوا ہوں کہ یہ قطعی ٹھیک نہیں جو ادھر کی آگ ادھر لگائی جاتی ہے "

"تو یہ بات آپ بھی کہہ سکتے ہیں؟" اسنے ہم پر بھرپور طنز کیا تھا۔

" اگر آپ اس قابل سمجھیں" ہم نے انکساری کی تھی۔

"لیکن کم از کم آپ کی زبان پر یہ باتیں زیب نہیں دیتیں!" اس نے سرزنش کی تھی۔

اور اس ذہنی جنگ کو ہم بتدریج اختتام پر لائے تھے۔

" صاحبزادی گستاخی معاف " ہم نے خاتمہ کلام کیا تھا۔ " آپ اپنی سرکار کو کچھ نیک مشورہ دیجئے کہ وہ " فری ورلڈ " والوں سے صاف صاف کہہ دے کہ یہ انگلستان کی سرزمین نہیں لہذا یہ سرزمین

موزوں نہیں جہاں رومیو جولیٹ جیسی المیہ داستان دہرائی جاسکے۔ اور احتیاطاً کوئی طربیہ داستان دہرائی جانے کے قابل ہو تو اس کا خاص ذکر کردیجیے گا ورنہ احساس لطیف کا اس سر زمین سے وارہ نیارہ ہوجائے گا،،

اور ہمیں جواب کے طور پر بتایا گیا تھا کہ ہم احساسِ لطیف کے "پیغمبر" تھے، اور ہم پر وہ پیغمبری (DEVIL) ڈیول یعنی حضرت شیطان کی اتاری ہوئی تھی۔ استغفراللہ۔ شیاطین کی صحیفہ برداری مشیت ایزدی کی ایما سے ہو سکتی تھی لیکن سپہر رفعت مآب سے ہم پر کوئی صحیفۂ آسمانی نازل نہیں ہوا تھا اور حاشا اللہ ہم نے احساس لطیف کی پیغمبری کا دعویٰ مرسل من اللہ بنکر نہیں کیا تھا۔ البتہ ہم پابدامن ہو رہے تھے اس میدان وفائے جفانما میں جس میں کہ ہمیں بے تحاشا کھدیڑا جارہا تھا۔ اور بجز نسوانی وحشت پسندی کے اس کی وسعت میں کچھ پنہاں نہیں نظر آتا تھا۔ اور یہاں بہر نوع خیریت تھی اور ہم بفضلہٖ اس بیماری سے محفوظ چلے آتے تھے، لیکن اپنی قضا سے مجبور کچھ ناکردہ گناہوں کے سلسلے میں مجرم تھے۔ مثلاً مس یاسمین کی جانب سے ہم پر یہ الزام تھا کہ ہمارے تعلقات تھے یعنی استغفراللہ ان تعلقات میں جذبات اور رومانس کو یکساں طور پر دخل تھا، سراسر بہتان تھا۔ اور الزام تھا تراشیدہ کہ ایک نیک خصایل اور فرشتہ شمایل "وین والنیٹر" کے ساتھ ہم مشترب ہونے کی وجہ سے ہمارے آپس کے غیر مستحسن اور ناستودہ تعلقات تھے۔ کجا احوالِ معشوقانہ اور کجا ان کی تقدس مآب اور واجب التعظیم شخصیت اور اس سلسلے میں شوقِ فضول کا کیا

مقام تھا جبکہ رومانس کے بجائے ان کی اطاعت ہمارے حق میں سعادت دارین کا موجب تھی۔ اشارات اور استعارات میں ہم پر عبارات چست کی جاتی تھیں کہ ہم گویا ایک نادان گلچیں تھے۔ جو ایک مرجھائے ہوئے پھول سے رنگینی نچوڑنے کی عبث کوشش کر رہے تھے، لیکن ہم اس رومانس کو تلاش کرتے تھے کہ اے خانہ خراب ستم پیشہ ناخدا ترس تو کس دل میں جاگزیں ہے، اس کی دنیا کیسی ہے اور ہم مجبوروں پہ خود مختاری کی تہمت کیسی؟ اور ہمیں وہ رومانس کہیں نہیں ملتا تھا۔ وہ شاید کوئی لاکائناتی تتے تھا جو ایک ایسے عالم سے تعلق رکھتا تھا جہاں وقت اور زمانہ نہیں۔ اور جو ان اشیائے کا العدم میں سے تھا جو ہلکے ارغوانی کائناتی شعاعوں میں تخلیق سے قبل کی غیر اجسامی حالت میں صدائے قم کی مشتاق تھیں اور پر کیف اور پر سوز زندگی کے لئے بیتاب تھیں اور وہ ہنوز زندگی کی تڑپ سے معمور نہیں ہوئی تھیں —— اور ہمیں ہنسی آتی تھی کہ انسان بھی کس قدر مجہول العقل ہے کہ مشاہدہ اور صحیح معائنہ نہیں کرتا کہ اس فرشتہ سیرت کی مضمحل شدہ رگ و پے میں "رومانس" (ROMANCE) کی تاب و تواں کہاں اور اس کے قلب و نظر میں وہ درجۂ حرارت کہاں کہ نگاہوں کی سحر آفرینیوں کو عذر بنا کر اعترافِ جرم کر لیا جاتا لیکن خاکم بدہن ہم ایسی جرات کسی حالت میں نہیں کر سکتے تھے۔

حالانکہ یہ کھلی زیادتی اور دست اندازی تھی لیکن ہم ایسی باتوں کو وقعت نہیں دیتے تھے۔ درانحالیکہ وہ جبلتِ نسوانی کی مضمرات اور مرغوبات کی فطری پیداوار تھیں اور آزاد سوسائٹی میں اپنی حدوں کو چاہتی تھیں جو کسی

غیر مستحسن وقوع کے سرزد ہونے کا باعث ہو سکتی تھیں یا [illegible] اس کے ان
دیئے گئے احوال میں ہم بے حجاب نہیں آسکتے تھے اور اپنی تحریک پر اپنا موقف
آشکار نہیں کر سکتے تھے اور صریحاً یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ یہ شکار کسی فتراک کا
سزاوار نہیں ۔ تو یہاں اس کی حاجت ہی نہیں تھی جبکہ ہماری صحرا نوردی اور
بادیہ نشینی ہماری فاش تصویریں تھیں جو ہمارے احوال و مقامات کی ترجمان
اور مبلغ تھیں ۔ اور ہم کسی ذہنی تحفظ کے شکار نہیں ہو سکتے تھے کہ کسی کے لئے
چاہ کنی کرتے ، کسی کی چاہ میں مجنون صحرا گرد ہوتے اور آگے چلکر طالب و مطلوب
دونوں ہی اس چاہ میں دفن ہوتے ۔

۱۰۔

شامتِ اعمال:۔

اس سلسلے میں ہماری شامتِ اعمال کا قصۂ کوتاہ یہ ہے کہ ہمارے ہم عصر ایک حضرت افسر تھے۔ انجینیئر کامل و فاضل اپنے فن میں اور تھے بڑے فرزانے کے آفس کے کاموں سے جی چراتے تھے۔ انگلستان کے کسی لارڈ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ اور تلخ تجربہ تھا ان کے ڈیسک کا کہ فائیلوں، موٹی موٹی کتابوں اور متفرد کاغذات کا ایک انبارِ عظیم لگا رہتا تھا جن پر گرد و غبار کے علاوہ انجن آئیل اور گریز وغیرہ کی کافی ملمع سازی ہوتی تھی اور کسی ضروری کاغذ کی تلاشی کے دوران جو ان کا دفتر چھان مارا جاتا تھا تو کاغذات کے انبار سے نٹس، بولٹس اور مشین کے اہم سے اہم پرزے برآمد ہوتے تھے اور ان کی تعداد کے پیشِ نظر ان پر کسی ورکشاپ کے ڈپارٹمنٹ کا گمان ہوتا تھا لیکن لطف یہ تھا کہ یہ تمام تر پرزے محض پیپر ویٹ کے طور پر استعمال

ہوئے تھے۔ اب جو کچھ کاغذات کی تلاشی ہوتی تھی جو چھ ماہ قبل تیار ہوئے تھے اور انہیں دے دیئے گئے تھے کہ وہ درج رجسٹر کر کے انہیں ارسال کر دیتے لیکن انہوں نے جو ڈیسک پر مشین کے کسی بڑے سے پرزے کے نیچے اس وقت احتیاطاً دبا دیا تھا کہ وہ ہوا کے کسی آوارہ جھونکے سے فرش پر تیرتے نہ ہوتے اور راز طشت از بام نہ ہو جاتے تو یہاں لطف یہ تھا کہ وہ انہیں اس طرح رکھ کر سرے سے بھول ہی گئے تھے اور وہ دفن ہو گئے تھے پے درپے کاغذات اور فائیلوں کے انبار کے نیچے اور اب جو برآمد ہوئے تھے تو کس کام کے! سر پیٹ لیا جاتا تھا اور افسر اعلیٰ تو دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیتے تھے اور یہاں نا قابلیت اور نا اہلیت کا کوئی سوال نہیں تھا۔ در اصل ایک ہر کسی کی قابلیت اور اہلیت مسلم تھی اور ہر فرد اپنے اپنے شعبے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا لہٰذا کام کی تقسیم کی غلطی عیاں تھی کہ ایک میکینکل انجینیر کے دوش و گردن پر آفس فائیلیں لاد دی گئی تھیں جن سے انہیں کچھ بھی شغف نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا تھا کہ آفس ڈیسک پر بھی وہ کل پرزوں سے شغل فرماتے رہتے تھے اور کاغذات پے درپے ڈھیر لگتے جاتے تھے اور ہر شام جب دفتر بند ہونے لگتا تھا تو وہ ڈیسک پر ایک الوداعی نظر ڈال کر ایک گہری سانس لیتے تھے پھر مستانہ چال سے سیٹیاں بجاتے ہوئے کاغذات کے ملبوں سے نکل جاتے تھے اور رفتار کہتی کہ کچھ بگڑا تو میرا ذمہ نہیں۔

لہٰذا آفس کی تنظیم میں نظر ثانی کی ضرورت تھی۔ اور نظر ثانی جو کی گئی تھی تو کافی تبدیلیاں عمل میں لائی گئی تھیں جن کی بدولت اس بے چارے افسر کو اس پر

انبار ڈیسک کو جلا بھی حاصل ہوئی تھی اور وہ ڈیسک ہمارا طوقِ گردن بنا ہوا تھا اور
ہمارے ساتھ شامت آئی تھی ایک مقامی خاتون والنیٹر کی جو بطور معاون
کے ہماری شریک کار بنائی گئی تھیں۔ اور اب جو ہم دونوں میں کوئی غلطی کرے
تو ساری ذمہ داری ہمارے دوش و گردن پر ہے۔ لیکن اب غلطی کا کوئی امکان
نہیں تھا کیونکہ دفتر سے وہ پرانے نٹس بولٹس رخصت ہو چکے تھے۔ اور وہ حضرت
افسر تو خوشی کی سیٹیاں بجاتے ہوئے رخصت ہو گئے تھے اور ہم گھبرا رہے تھے
کاغذات کے انبار سے جو ڈیسک کے اوپر تو خیر فرش کے طول و عرض میں بھی
دور دور تک دکان کی طرح ہر سمت اور ہر جانب لگے ہوئے تھے کہ قدم احتیاط
سے رکھتے تھے ورنہ ہر قدم پر ٹھوکر کھا کر گر پڑنے کا احتمال ہوتا تھا۔ اور یہ دکان
اس حضرت افسر نے نہیں لگائی تھی بلکہ آفس اردلی نے! ۔ اور آفس اردلی
کا زیادہ قصور نہیں تھا کہ وہ بے چارہ کاغذات کا انبار پہلو یہ تھامے کب
تک کھڑا رہتا کہ وہ حضرت کل پرزوں سے مستقل شغل فرماتے رہتے اور
مستغرق ہوتے اور کبھی جو غلطی سے فارغ ہوتے تو محض اشارہ کر دیتے فرش
کی طرف اور وہ ان کو فرش پر ڈال کر جلدی جلدی فرار ہو جاتا اور اسطرح
دفتر کی پیہم تشکیل ہوئی تھی۔ اور اب ہم تنگ آئے تھے ان ضروری کاغذات
کو پرواز کی حالت میں پکڑتے پکڑتے، مسلسل تین دن کی تگ و دو جانفشانی
اور دماغ سوزی کے بعد ہی وہ ملبہ صاف ہو سکا تھا، اور ہم خداوند لامکانی
کی حمد و ثنا کر رہے تھے کہ ساری جانفشانی اور دماغ سوزی ہیری کا ہے اور
اعتراف کر رہے تھے کہ سلیقہ ڈسپلن صفائی اور خوش اسلوبی صنفِ مخالف

کی ہے کہ اس سلسلے میں اسے خاص امتیاز حاصل تھا اور تسلیم کرنا پڑا تھا۔
اس صفت کو خداوند بزرگ و برتر نے خاص ملکہ عطا فرمایا تھا اور اسی کی شاید خاص کر موجودہ زمانے میں صرف آفس ورکس کے لیے تخلیق فرمائی تھی کہ ان کو اس کام میں ایک یدِ طولیٰ حاصل تھا اور ان کی فرض شناسی اور بلند اخلاقی ہمارے حلقہ احباب میں ضرب المثل تھی اور قطع نظر ان اوصاف کاملہ اور جامعہ کے ان پر کیچڑ اچھالا جاتا تھا اور ہم جو لاکھ دامن بچاتے تھے تو اس سے محفوظ نہیں نظر آتے تھے۔

عام طور سے لوگ سینس رکھتے تھے اور اپنی بصارت اور سماعت پر یقین رکھتے تھے اور انہیں ہمارے نکتہ نظر سے ہمدردی ہو سکتی تھی، لیکن اگر کوئی شخص لاکھ ذہین اور فطین ہوتے ہوئے بھی تجاہل سے کام لے اور مغالطہ کا شکار رہے اور اپنی طبیعت کی پرفنی اور بے باکی اور اپنے وضع و انداز کی دھاندلی میں کسی کا وقار کسی کی عزت اور کسی کے خلوص نیت پر کیچڑ اچھالے، اس کی توہین کرے اور اس کی کامل وضع داری کو داؤں پر کھیل جائے اس وقت اسے غصہ ضرور آسکتا ہے لیکن مشاہدہ کا اصولی نہیں کہ غصے کا سہارا لیا جائے۔ ایسے مرحلے میں عقل یہ کہتی ہے کہ جہاں تک ہو مطالعہ پر اکتفا کیا جائے۔ پھر سوچنے کی بات ہے کہ ایک دوشیزہ جسے ہم مان چکے ہیں، اور آزما چکے ہیں کہ وہ ایک فرشتہ ہے اور بذات خود عفت مجسم ہے۔ لطافت کا صنم ہے، سادگی کی پیکر ہے اور پھر روشن ضمیر اور پاکیزہ گوہر ہے پھر اگر وہ مغالطہ اور اوہام میں گرفتار ہو اور اس سے کچھ لغزش ۔۔۔

ناانصافی سرزد ہو تو اس کے کیرکٹر کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنا محض ایک بڑی غلطی نہیں بلکہ سراسر ایک جذباتی گدھاپن ہے، اگر ایسی لڑکی سے کچھ زیادتی بھی سرزد ہو تو ضروری نہیں کہ خود بھی غلطی کریں۔ یہ اور بات ہے کہ اسے غلطی نہیں کرنی چاہیئے لیکن اگر وہ غلطی ہی کرے تو کیا کیا جائے جبکہ ہماری زندگی کے کچھ رخ اور تھوڑے سے کردار ہی اس کے پیش نظر ہوں اور ہماری بقیہ ذات وصفات اس کی نگاہوں سے مکمل طور پر اوجھل ہوں اور چہ جائیکہ یہاں غلطی کا کوئی امکان نہیں ہو سکتا تھا در انحالیکہ یہاں زیر مشاہدہ اس کا ایک قریبی رخ تھا جو اس کا سارے اصناف واکناف نگاہوں کے آگے بے پردہ کئے ہوئے تھے۔

چنانچہ ہماری نگاہوں میں اس کی ذات منور ستاروں کی طرح بلند اور چاند کی طرح منور تھی، البتہ اس کی شخصیت ایک مایوس کن کرشمہ رکھتی تھی کہ وہ اپنی ذات کی رفعت اور سربلندی میں کسی کی بھی انفرادیت کو اپنے پاؤں تلے روندنے سے احتراز نہیں کرتی تھی کیونکہ وہ جبلتاً کسی کی انفرادیت کو تسلیم کرنے کا مجاز نہیں تھی۔ اور یہ حیرت کی بات نہیں تھی، اور یہیں ساری ٹریجڈی بھی پنہاں تھی۔ بایں ہمہ وہ محض فرشتہ سیرت ہی نہیں تھی بلکہ وہ ایک انسان نژاد جاں نثار والہ وشیدا، پر ذوق، اور پر تکلف میزبان کی چشم وچراغ اور نور نظر بھی تھی اور حاشاء اللہ اس سے ہم کسی غیر مستحسن سلوک کے مرتکب نہیں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ ہم ہر اتفاق کو بہ حسن وخوبی نباہتے جاتے تھے۔

"دیکھتی ہوں ہماری مقامی خواتین بھی اب آپکے دفتروں کی زینت

بنتی جارہی ہیں،، یاسمین نے خیال آفرینی کی تھی۔

"یہ عام بات ہے،، ہم نے سرسری جواب دیا تھا۔

"عام کیسے؟ پھر وہ گشت لگاتی ہوئی باتیں جن کا کہیں نہ کہیں مسکن ضرور ہے،، اس نے قدرے بات اچھالی تھی۔

"اس مسکن کی آپ فکر نہ کریں،، ہم نے بیدلی سے جواب دیا تھا "آپ کے لئے یہ اتنا اہم نہیں۔ اور آپ تعلیم سے زیادہ لو لگایئے کیونکہ امتحان زیادہ قریب ہیں،،

"لو تو بہر حال لگانا ہی پڑے گا،، اس نے بات بنائی تھی "لیکن کانوں پڑی بات سے کچھ تکلیف ہوتی ہے،،

"تو پھر تم اس بے تکی بات کو جلد کہہ ڈالو،، ہم نے جواب دیا تھا۔ "ورنہ آگے چلکر تمہیں کچھ زیادہ تکلیف ہوگی۔ اور پھر تمہاری وہ تکلیف میرے لئے بھی باعثِ تکلیف ہوگی،،

"تب میں کچھ نہیں کہتی،، وہ اڑ گئی تھی۔

"نہیں نہیں۔ تم دل کی بات فی سبیل اللہ کہہ ڈالو اور دل کو ہلکا کر ڈالو،، ہم نے اصرار کیا تھا۔

"یوں تکلیف کچھ نہیں،، اسنے تاویلات باردہ کا آخر سہارا لے ہی لیا تھا۔ "ماسوا اس کے کہ "سر دس،، کا کچھ اخلاقی دستور اور ایک معیار ہوتا ہے اور آپ جس مکتبِ خیال کے پیرو ہیں اس کے پیش نظر یہ ایک اہم بات ہے۔ اور جائے حیرت ہے کہ "فری ورلڈ،، کے

پر تمکین سرکاری دفتروں میں "پیشہ وروں" کے لئے بھی کچھ جگہ
ہو سکتی ہے ۔"

"بات بس اسی قدر ہے یا مزید مواخذہ کی ضرورت ہے۔" ہم نے
اسے ملامت کی تھی "آپ اخلاق کا ایک اہم پہلو نظر انداز
کرتی ہیں، درانحالیکہ اگر وہ "والنیٹر" بقول آپ کے ایک پیشہ ور
ہے اور اس کو سروس میں جذب کیا گیا ہے تو انسانیت اور سوسائٹی
کے ناطے اس سے بڑھ کر کوئی مستحسن اقدام نہیں، آپ غور کیوں نہیں
کرتیں کہ اس وسیلے سے ایک بے راہ زندگی کو پُر تمکین بنانے کی کتنی
اچھی صورت نکالی گئی ہے اور شرم کی بات ہے کہ آپ کی زبان
سے مخالفت کی صدائیں بلند ہوں ۔ میں تو چاہتا ہوں کہ ان کی
سروس مستقل ہو۔"

"میں نے یہ نہیں کہا کہ ان کی سروس مستقل نہ ہو حالانکہ میں ایک خاص
ڈرامے کی طرف آپ کا دھیان مبذول کرنا چاہتی تھی جس کے داخل
ہیرو کے طور پر زبانِ خلق آپ کو نامزد کرتی ہے۔" اس نے بات کا
رخ بدل دیا تھا۔

" اور ہمیں حیرت ہے کہ علم و دانش کے زیور سے آراستہ ہوتے
ہوئے بھی آپ ایسے گھٹیے خیالات کو اپنے ذہن میں جگہ دے سکتی ہیں!"
ہم نے قطع کلام کیا تھا۔

جب ہم ناکردہ گناہوں کے سلسلے میں سخت مجرم تھے لیکن ہماری جبینِ

استقامت پر شکن نہیں آئی تھی کیونکہ ہم کسی ڈرامے کے ہیرو نہیں تھے۔ اور ہمیں یقین تھا کہ یہ "واقعات" محض ان کے ذہن میں وقوع پذیر ہوئے تھے چنانچہ اس گفتگو کو اسی جا ملتوی رکھنا چاہتے تھے لیکن خجستہ خاتون پیش قدمی پر مصر تھی۔

"گل چینی کا شوق برا نہیں لیکن ذوق نظر کا ایک اسٹینڈرڈ ہوتا ہے"
اس نے ایک دوسری ضرب لگائی تھی۔

لیکن ہم گل چینی اور باغبانی کے سلسلۂ شوق میں بالکل صفر تھے۔ وہ یہی کہنا چاہتی تھی کہ ہمارا کچھ ذوق نظر تھا اور ذوق نظر ہی نہیں بلکہ ہماری نگاہیں ذوق فرسائی تھیں۔ ایک مرجھائے ہوئے پھول سے جہاں ہمارے ذوق نظر کے لئے کوئی سہارا نہیں تھا۔ یہ بھی ایک پرواز تخیل تھا۔ اس وہم و گمان کا کوئی علاج نہیں تھا۔ ہم بھی کچھ تند و تلخ نظری حقائق سے پردہ کشائی کرنے پر مجبور ہوئے تھے۔

"ہم محققانہ نظر رکھتے ہیں" ہم نے عرض کر دیا تھا "اور ہماری نگاہیں انصاف کے ساتھ صحیح صحیح مشاہدہ کرتی ہیں۔ ان اٹھتی ہوئی تازہ دم الہڑ جوانیوں سے کہیں زیادہ دل نواز اور مسحور کن وہ مرجھاتی ہوئی جوانیاں ہوتی ہیں جنہیں دل کی دنیا میں قدرتاً زیادہ سوز عطا ہو چکا ہے۔ بسا اوقات ہمارے دل میں ایک وحشت سی ہونے لگتی ہے کہ ہم دیوانہ وار بڑھیں اور دست قدرت کو تھام لیں اور اس سے عاجزی کریں کہ اے ستم پیشہ ناخدا ترس ان گلہائے شگفتہ

کو مرجھانے تک ہی رہنے دے کہ آخری وقتوں میں ان کی حسن کی معراج کو پہونچی ہوئی ہوتی ہیں،،

ہمارے میزبان کے جذبات عالیہ کو ٹھیس لگی تھی اور ان کا منہ ذرا سا نکل آیا تھا لیکن انہوں نے تیر چلانا موقوف نہیں کیا تھا۔

"اور للّٰہ آپ قدرت کے ہاتھوں کو تھامتے وقت یہ بھی عرض کر دیجئے گا کہ وہ اپنا قانون بدل دے اور وہ کلیوں کو ہرگز ہرگز پھول نہ بننے دے" انہوں نے طرح دی تھی۔

لیکن ہم حقائق سے گریز کس طرح کر سکتے تھے دراںحالیکہ صحیح ریسرچ اور درست تحقیق بدیہی طور پر یہی بتلاتے تھے کہ یہاں دخل تھا صرف تشنہ جذبات کو جو تحقیق کے بجائے خود رو تخیل کے میدان میں بے تحاشا دوڑ رہے تھے جنہیں احساس لطیف سے حاشا کچھ بھی نسبت روحانی نہیں تھی۔ اب ہم سے نہ رہا گیا تھا اور ہم نے عروس حقیقت کو بے نقاب کر دیا تھا۔

"آپ کو دل کی دنیا کا تجربہ کیا،، ہم نے ان سے براہ راست سوال کیا تھا " دل کیا اور دل کی دنیا کیسی ؟ دوشیزگی کی ادائیں دل فریب سہی لیکن وہ ہنوز شعلۂ خام ہیں اور ان خام شعلوں کی بضاعت پر دلوں کی دنیا کو خاکستر کرنے کا قصد رکھنا کسی قدر قبل از وقت ہے چنانچہ اس آگ کو سعیِ بلیغ کے ساتھ دل میں تھامنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ زیادہ مشتعل ہو۔ اور مشتعل ہو کر اس قدر جلے کہ پہلے اپنے دامنِ دل کو خاکستر کر ڈالے پھر کسی کے جسدِ خاکی

کی طرف رجوع کرے۔"

اور یاسمین نے تو ہماری وضعداری پر ایک کاری ضرب لگائی ہی تھی لیکن اس نے اپنے حجاب و شرم کی بھی مٹی پلید کی تھی۔

"پھر تو امتحان شرط ہے۔ آج کی شب کہ چاندنی میں نہائی ہوئی رات کی قدر دانی کا صحیح علم ہم میں ہے یا آپ میں۔ چلئے آج اسی کی آزمائش ہو جائے۔" انہوں نے سخت جسارت آفریں جواب دیا تھا اور یہاں سکتے میں آگئے تھے کہ یہ نئی بات کیا ظہور میں آئی، کتنا غلط طریقہ تھا اور کس قدر مجرمانہ اقدام تھے کہ کار منگالی گئی تھی اور ہم شب ماہ میں جذبات کے امتحان کے لئے بیس میل کے سفر میں نکلے تھے جو دراصل روحانی منفعتوں کا ایک امتحان تھا۔ اور چونکہ وہ ایک امتحان ہی تھا لہٰذا خوش فہمی کا مقام نہیں تھا۔ زیر لب دعا گو تھے، لیکن یہ کیا کار پر بیٹھتے ہی مس یاسمین نے خاموش رہنے کی قسم کھالی تھی۔ پھر تو ہم نے بھی ساکت و جامد رہنے کا بیڑا اٹھا لیا تھا۔ اور نتیجہ یہ ہوا تھا کہ ہمارے اس مشترکہ رویہ سے یہ سیر و سفر خاصا معمہ بن گیا تھا اور ادھر کار ایک معینہ رفتار سے پہاڑوں دروں کو چیرتی اور میدان و مزروعات کو پیچھے کی طرف ڈھکیلتی جا رہی تھی۔ اور ہم ایک مسافر کی طرح کار کی ایک سیٹ پر بیٹھے اس طرح چلے جا رہے تھے کہ گویا کرائے کی ٹیکسی پر سفر کر رہے تھے ایک بے تعلقی کے عالم میں مس یاسمین گاڑی چلا رہی تھی لیکن سنجیدگی کی ایک داستان اور عبرت کی ایک تصویر بنی ہوئی تھی۔ اور آفریں ہے اس صداقت ختم کے کیرکٹر پر کہ وہ اپنا غیر متزلزل معصومیت کا پرسکون مظاہرہ کرتی جا رہی تھی

جس کے آگے خاکی انسان کی ساری جبارتیں سرنگوں تھیں - اور دیکھا تھا قلیل دقفہ کی چاندنی تھی اور اتنی طویل مسافت سیر میں کیا۔ بدقت تمام سفر میں طے ہوئی تھی - اور چاندنی کی قدردانی کا علم تو خیر بڑی بات تھی یہاں چاند ہمیں کسی جان لیوا حادثہ سے دوبراہ ہونے سے بمشکل محفوظ رکھے ہوئے تھا، راہ میں کتنے خیاباں اور بیاباں آئے تھے لیکن کار ایک شانِ بے نیازی کے ساتھ آگے نکل گئی تھی - راہ میں قدرت نے محاسن کتنے ہی جال بچھائے تھے اور کتنے ہی گلزار و چمنستان حائل کئے تھے، لیکن کار دامن بچاکر نکل گئی تھی، کار سمندر کے ساحل سے گذری تھی اور کتنے ہی دل چھیننے والے مناظر ہماری آنکھوں میں انگلی ڈال ڈال کر اپنی موجودگی کا اعلان کر رہے تھے - لیکن کار ایک بے اعتنائی کے عالم میں آگے نکل گئی تھی، کار سڑک پر فراٹے بھر رہی تھی اور سنہرے ریت پہ چاندنی رقص کر رہی تھی اور سمندر دن کی لہروں سے ہم آغوش ہو رہی تھی، لیکن کار سب کچھ نظر انداز کر رہی تھی - کار مسلسل آگے بڑھتی جا رہی تھی اور سرِ راہ کے مناظر ہمارے پیش نظر تھے کالے کوسوں کی سڑک نیچ ہی تھی اور دو رویہ انجیر وہبی اور سرو و صنوبر کے درخت جھوم رہے تھے، لیکن کار ایک بے تعلقی کے عالم میں آگے نکل گئی تھی - کار بدستور آگے نکلتی جا رہی تھی اور چاندنی میں نہائے اشجار و اثمار اور جھومتے اور رقص کرتے ہوئے گل و گل سب ہی پیچھے بھاگتے جا رہے تھے سڑک کی ہر دو جانب کبھی کبھی روشن مکانات اور کلیسا بھی آتے تھے لیکن ایک ایک کر کے وہ سارے پیچھے ہی چھٹتے جا رہے تھے، لیکن خیر ہوئی تھی کہ

کار ابھی لبِ ساحل کے ایک ارغوان زار میں داخل ہوئی تھی کہ سنگِ مرمر کے ایک مجسمہ کے قریب خود بخود مغلوج ہو گئی تھی کیونکہ انجنیر بیری اور بیری بلاسم کے باغات کے لامتناہی سلسلے میں آگے کا راستہ گم تھا۔ ہم کار سے اتر پڑے تھے لیکن یاسمین اترنا بھول رہی تھی۔ لیکن یہ کیا وہ تو اسٹیرنگ کا سہارا لے چکی تھی۔ ہم نے جلدی جلدی اسے جھنجھوڑا تھا کہ چاندنی اب زیادہ دیر نہیں تو وہ دفعتاً چونک پڑی تھی گویا اسے اک بیک ہوش آگیا ہو اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کچھ بات بھول رہی تھی اور وہ بات اسے اب یاد آگئی ہے، اور وہ جلدی جلدی کار سے نیچے اتر پڑی تھی۔ اور ہم نے دیکھا تھا خواہ کچھ ہی ہو یاسمین کی طبیعت اس وقت ٹھیک نہیں تھی حالانکہ وہ زورِ طبع سے اپنی طبیعت کو ٹھیک ہی بتلا رہی تھی۔ اور ادھر اپنا دل ڈوب رہا تھا اور ہم آگے بڑھ کر سنگِ مرمر کے مجسمہ کا سہارا لے چکے تھے۔ اور یہاں پہلو میں جو دل کا بہت شور سنتے تھے تو آج پتہ چلا تھا حضرتِ دل اتنے بڑے جانباز نہیں تھے جو یاسمین جیسی نوجوان لڑکی کو کھلے بندوں دعوت دے سکتے تھے کہ تو نے جو خلوت کے لئے اس ویرانے کا سہارا لیا ہے تو تو اب بے جھجک آ اور اس قدر قریب آ کہ دو دلوں کی دھڑکنیں ایک ہو جائیں ہم اپنے دل کو بار بار ٹٹول رہے تھے لیکن کہاں وہ ایسا جسور کہاں تھا؟ اور وہ ایسی جسارت کر بھی کیسے سکتا تھا درانحالیکہ شہر میں بھی وہ یاسمین سے اب تک خلوت ہی میں ملتا رہا تھا۔ لیکن وہ دم خم کہاں تھا۔ اور وہ دم خم لاتا کہاں سے جبکہ وہ ایک کنواری دوشیزہ سے یہ توقع نہیں کر سکتا تھا کہ وہ

اپنی تحریک پر کسی نوجوان کا دامن تھام لے اور اس سے کہے کہ آؤ تم مجھے اپنے قوی حسین بازوؤں میں سمیٹ لو اور مجھے اس قدر جکڑ لو اور اس قدر بھینچو کہ میری ہڈیاں نے کی طرح بولنے لگیں ۔ اور ہماری نس نس سے اور جوڑ جوڑ سے اٹھتے ہوئے درد کا ہیجان ایک آن میں دفع ہو جائے اور ایسی بات وہ کسطرح کر سکتی تھی جبکہ وہ آخر ش ایک لڑکی ہی تھی وہ تو حملۂ عردسی میں بھی تیار نہیں کہ اس کا قانونی شوہر اس پر آسانی سے غالب آجائے اور اس کے کنوارپن کا دامن بغیر کسی مزاحمت کے چاک کر ڈالے ، حالانکہ وہ قانونی اور سماجی دباؤ سے رام کر لی جاتی ہے لیکن طبعی لحاظ سے یہ اس کے لئے ایک مقام شکست ہے اور اس شکست کے بعد وہ کبھی سر نہیں اٹھا سکتی اور اس کے بعد وہ کبھی اس مقام پر نہیں ہوتی جہاں سے وہ مردوں سے نظر ملا سکے ، اس کی وہ فطری تمکنت اور سر بلندی اور اس کی نگاہوں کی ایک چمک جو اس کی دوشیزگی کی ایک خاص ودلیعت ہے اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھن جاتی ہے ۔ کہاں اس کا وہ فطری بے ساختہ پن کہاں اس کی سادگی اور بے باکی کہاں اس کی شمشیر بے نیام کی تیزی اور کہاں اس کی اپنی منور ذات کہاں اس کا اپنا انجی چو کھا رنگ اور کہاں اس کی بلند و بالا انفرادیت اور پھر کہاں یہ جلتی چکر جس میں اس کی ذات اور شخصیت مجروح و مفتوح بن جاتی ہے ۔ اور اسکا ایک نہ مٹنے والا احساس کمتری اور ایک ناقابل تلافی ذہنی خسارہ اس کی زندگی کا ایک جزو بن جاتا ہے ــــ پھر وہ اپنی تحریک پر ایسی بات کسطرح کر سکتی تھی ! اور یہاں بھی جسارت نہیں تھی کہ ایک تعلیم یافتہ اور

روشن خیال لڑکی سے اپنی حماقت کا مظاہر کرتے اور اس سے ایک مجرمانہ درخواست کرتے جس کو اس کا گنوار پن ایک دم سے گھبرا کر مسترد کر دیتا۔ اور ہم ایسا کرتے تو کیوں کرتے جبکہ اپنا مقام بہت ہی بلند تھا اس لئے کہ اس کی انمول دوستی اخلاص اور محبت میرے حصّے میں آئی تھی اور یہ چیزیں کچھ ایسی انعمت تھیں جو کبھی کسی لڑکی کے صیاد شوہر کو نصیب نہیں۔ کیونکہ شوہر کے حصّے میں تو فقط اس کی مجروح شخصیت، مقید ذات اور احساس کمتری سے لبریز اس کی ایک ذہنیت آتی ہے، جہاں بناوٹ تصنّع اور آورد کے سوائے ساختہ محبت اور اخلاص کی گنجائش نہیں۔ یہی ایک بات ہمارے اور یاسمین کے تحت الشعور میں تھی جو ہمیں ایسے سہانے ماحول میں بھی لاشعوری طور پر ایک دوسرے سے اجنبی بنائے دے رہی تھی۔ اور اس کا کوئی علاج نہیں تھا۔ اور محبت کے لئے جنگل اور ویرانے کی کیا قید محبت تو آباد شہروں میں شارع عام پر عین نگاہِ خلق پر بلکہ نگاہِ خلق میں انگلی ڈال کر کی جاسکتی تھی۔ کھلے عام سڑکوں اور شاہراہوں پر اس کے ترانے گائے جاسکتے تھے اور اعلانیہ گلیوں اور بازاروں میں اسکے نعرے بلند کئے جاسکتے تھے اور بے جھجک قصر و ایوان پر اس کے پرچم لہرائے جاسکتے تھے کیونکہ محبت ایک حقیقت ہے اور جو کچھ حقیقت ہے وہ حق ہے اور برحق ہے! اور اعلان حق ہر جگہ ہر حالت میں ہر وقت اور ہر وقت کیا جاسکتا تھا۔ اور یہ اعلان تو ہم شب روز ڈنکے کی چوٹ پر کرتے آرہے تھے۔ پھر ہم آج اس ویرانے میں کونسا جھک مارنے آئے تھے، درحقیقت ہم اس ویرانے میں خلوت کی تلاش میں ہرگز نہیں آئے تھے۔ ہم آئے تھے چھٹکی ہوئی چاندنی کا لطف اٹھانے۔ اور بس یہی بات تھی۔

"یاسمین جلدی کرو۔ چلو ہم فوراً شہر کو لوٹ چلیں۔ ہم نے قدرت کی چاندنی کا خوب لطف اٹھا لیا اور اس قدر لطف اٹھایا ہے کہ اب اس کی مزید ضرورت نہیں!" ہم نے یاسمین کو واپس چلنے کی تلقین کی تھی۔

"لیکن ٹھہرئیے تو۔ اتنی جلدی یہ بات کیسے ہو گئی، چلنے کے لئے کیا ہے چلتے ہیں۔ لیکن ایک بیک یہ جلدی کیا پیش آ گئی" یاسمین نے فوراً بات کاٹ دی تھی۔

"یاسمین۔ تم سمجھتی نہیں۔ چاندنی کا لطف اس طرح نہ تمہیں حاصل ہوگا نہ ہمیں تا وقتیکہ ہمارے دل میں صحیح قسم کا ایک درد اور ایک کسک موجود نہ ہو چلو وہ درد اور کسک ہم شہر کی گلیوں اور بازاروں میں چلکر پیدا کر لیں پھر کسی اور دن ویرانوں کی سیر کر لیں گے" ہم نے یاسمین کو جھنجھوڑا تھا۔

"تو وہ کونسی بڑی بات ہے وہ بھی کر لیا جائے گا۔ اتنی جلدی کیا ہے چلتے ہیں" وہ جانے کے لئے تیار نہیں تھی۔

اور یاسمین مجسمہ کے پائیدان پر خود بھی ایک دوسرا مجسمہ بن کر بیٹھ گئی تھی۔ اور دیکھا تھا سنگِ مرمر کا وہ مجسمہ چھٹکی ہوئی چاندنی میں مطلعِ انوار بنا ہوا تھا۔ وہ مجسمہ کسقدر حسین تھا کہ اس پر نگاہیں نہیں ٹھہرتی تھیں۔ وہ چاندنی میں سرتاپا غرق تھا اور اس قدر منور تھا کہ اس نے نور کے شعلے نکل رہے تھے جو ہمارے صبر و سکون کے خرمن کو جلا کر خاکستر کئے۔۔۔

تھے اور زیادہ مجسمہ اپنے آرٹسٹ کا شکوہ کر رہا تھا:۔

"اے آرٹسٹ تو نے میرے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ تو نے اچھا نہیں کیا کہ ہمارے بے پناہ حسن کو سنگِ مرمر میں اسیر کیا۔ تو کس قدر ناداں ہے کہ اپنے آرٹ سے ہمارے حسن کی نمایش کرنا چاہتا تھا لیکن تجھ سے یہ کہاں ہو سکا ــــ تیرے آرٹ سے تو تیری اپنی خود پرست ذات ہی جلوہ گر ہوئی ہے!"

اور ہم اپنے مالک کی شکایت کر رہے تھے جو ہماری رگِ گردن سے بھی زیادہ قریب تھا۔ لیکن ہمارے دل کے احوال سے بے خبر تھا۔

"تو نے انسان کی حسین مورتی جو بنائی تھی تو محبت ہی کی خمیر سے بنائی تھی۔ لیکن یہ کیا؟ ۔ تن کی محبت من کو کھوتی ہے اور من کی محبت تن کو کھوتی ہے! اور جبکہ تن اور من دونوں ہی کھوئے گئے پھر باقی کیا رہا؟ ــ تیرا سر!"

اور وہ مجسمہ اس قدر حسین تھا کہ ہم محو نظارہ تھے اور یاسمین مجسمہ کے پائیدان پر بیٹھی فکر کے بحر عمیق میں غرق تھی، وہ ہم سے اس وقت بات بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اور ہم نے دیکھا تھا مجسمہ پر ایک کتبہ لگا تھا جس کی تحریر بتلاتی تھی کہ وہ مجسمہ ایک یونانی ہیرو کا تھا جو ۱۹۲۲ء میں ترکوں کی لڑائی میں کام آگیا تھا اور وہ ایک ایسی داستان سنا رہا تھا جو میری سماعت کے لئے بے حد اختلاج آور تھی۔ اور ہمارا دل بیٹھا جا رہا تھا کہ یاسمین کو پھر کیا ہو گیا اب ہم سے نہ رہا گیا تھا ہم نے سکوت کو منتشر کر دیا تھا۔

"مس یاسمین! میں چونکہ ایک طرح سے ترک ہوں لہٰذا مجھ سے اس وقت تمہیں کسی قدر نفرت دامنگیر ہے۔ شاید میں ایسا سوچنے میں حق بجانب ہوں!؟" ہم نے یاسمین کی پر اسرار خاموشی کے قلعہ کو مسمار کرنے کے لئے کاری ضرب لگائی تھی۔

"نہیں نہیں۔ سنگ مرمر کی یہ حسین مورتی نفرت نہیں سکھلاتی!" یاسمین ایک دم سے تڑپ گئی تھی اور اس کی خاموشی کا شیرازہ خود بخود بکھر گیا تھا۔

اور ہم نے دیکھا تھا یاسمین کی طبیعت بالکل موزوں تھی کہاں کی افسردگی اور کہاں کی سوگواری وہ تو بلبل کی طرح چہکنے اور پھول کی طرح کھلنے لگی تھی اور ہمیں شک ہوا تھا اس کی یہ تمام تر سوگواری اور افسردگی کیا تھی۔

"پھر تو تم یہ بتلادو۔ یہ مورتی کیا سکھلاتی ہے" ہم نے یاسمین کو باتوں میں الجھلانے کی کوشش کی تھی کہ مبادا وہ تفکر کے بحر عمیق میں پھر غوطہ نہ لگانے لگے۔ اور ادھر قریب کے کسی کلیسا کے گھنٹے کی نقرئی صدائیں کانوں میں رس گھولنے لگی تھیں۔ یاسمین پہلے تو متامل ہوئی تھی اور کسی قدر جھجکی تھی، لیکن رفتہ رفتہ واضح ہوتی گئی تھی۔

"بتاؤں۔ برا تو نہیں ماننے گا" اس نے نہایت خوبصورتی سے تمہید کی تھی۔

" نہیں بیٹا برا کیوں ماننے لگا۔ تم بے جھجک بات کرو" ہم نے
اس کی ہمت افزائی کی تھی۔
" یہ مورتی کیا سکھلاتی ہے" اس نے کسی قدر سوچ کر جواب دیا تھا
" یہ محبت کا درس دیتی ہے۔ کمالِ محبت کا درس!۔ اور ادھر دیکھئے
ہم بھی محبت کی ایک مورتی ہیں اور اپنا کمال یہ ہے کہ کسی دشمنِ جاں سے
بھی والہانہ محبت کر سکتے ہیں۔ اب آپ سوچئے اس سے بڑھ کر بھی
محبت کا کوئی تخیل ہے؟"
اور یہاں محسوس ہوا تھا محبت کا تخیل خواہ کچھ ہی ہو لیکن یاسمین
نئی طوطا چشم کہ اسے ہم جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے تھے لیکن وہ
ہمیں عین ہمارے منہ پر دشمنِ جاں کہہ رہی تھی۔
" بات بنانا تمہیں خوب آتی ہے" ہم نے اس کی شکایت کی تھی۔
" لیکن۔ تو بتاؤ میں تمہارا دشمنِ جاں کب کا ہوا؟"
" آپ دشمنِ جاں نہیں؟ آپ محبت کی اصطلاح میں البتہ دشمنِ جاں
ہیں اور آپ برا نہیں مانیں آپ بھی تو مجھے دشمنِ ایمان کہتے ہیں!"
۔ یاسمین نے ہمیں بات سمجھا دی تھی۔
اور ہم اس دشمنی پر غور کر رہے تھے جو ہم نے کبھی نہیں کی تھی کہ یاسمین
نے ہمیں مزید سمجھانے کی کوشش کی تھی۔
" آپ دشمنِ جاں نہیں؟ آپ نے میرے ساتھ کیا کیا نہیں کیا!" اس نے
انتہائی مظلومیت کا پیرایہ اختیار کر لیا تھا۔

"کیا بات کر رہی ہو یاسمین"، ہم نے اسے ٹوک دیا تھا۔

"کیا میں فضول بات کر رہی ہوں؟ تو گویا آپ نے میرے ساتھ اب تک بے رخی نہیں کی اور میرے جذبات کی توہین نہیں کی" اس نے شکایت کا ایک دفتر کھول دیا تھا۔ اور ہم حیران تھے۔

"تم چاہے جو کچھ کہہ لو لیکن خدا کے لئے یہی ایک بات نہ کہو" ہم نے یاسمین کی منت کی تھی "کیونکہ آج تک ہم نے تمہارے جذبات کی کبھی توہین نہیں کی"

"تو گویا آپ ہم سے اب تک محبت ہی نباہتے رہے ہیں؟" اس نے بڑا دلچسپ سوال کیا تھا۔

"تو کیا تم سمجھتی ہو کہ ہم تم سے اب تک دشمنی ہی کرتے آئے ہیں؟" ہم نے حیرت کا اظہار کیا تھا۔

"لیکن اثباتِ محبت کے لئے آپ کے پاس کوئی ٹھوس پروگرام بھی ہے یا فقط محبت کا ایک ترانہ؟" یاسمین نے آخر ایک لگتی ہوئی بات کہہ ہی دی تھی۔

اور یاسمین نے یہ بات واقعی جچتی ہوئی کہی تھی۔ لیکن یہاں یہ حال تھا کہ پہلے ہم پر رقت طاری ہوئی تھی اور پھر سکتہ طاری ہوا تھا اور پھر کامل ہوش آگیا تھا۔

"یاسمین تم فکر نہ کرو۔ یہاں محبت کا ترانہ بھی ہے اور ٹھوس پروگرام بھی ہے"، ہم نے جلدی جلدی جواب دیا تھا "اور شاید اس پروگرام

پر عمل درآمد ہونے سے پیشتر ہمیں کچھ ٹھوس اقدام اٹھاکر سر راہ کے

کسی کلیسا کا در کھٹکھٹانا پڑے گا۔ اور کلیسا دور بھی نہیں۔ چلنا ہے

کلیسا کو؟" ہم نے اسے کھینچا تھا اور اسنے مزاحمت کی تھی اور وہ

نہیں گئی تھی۔

"کلیسا کی کیا ضرورت۔ بس اس مجسمہ کے سامنے اقرار کر لیجئے"

یاسمین نے فوراً ترکیب بتائی تھی "یہ عظمت اور تقدس کے لحاظ

سے کسی کلیسا سے کمتر نہیں اور اس کی شہادت کو اقبال کا درجہ

حاصل ہے"

"اور تم؟"

"میں بھی"

اور سچ تو یہ ہے کہ ہمیں اس مجسمہ کے روبرو جرم الفت کا اقرار

کرنا پڑا تھا اور واقعی وہ مجسمہ گواہ تھا ایک ایسی محبت کا جو

ساری علتوں سے بے نیاز تھی۔ اور چونکہ وہ مجسمہ کچھ ازلی حقایق

کی نشاندہی کرتا تھا لہٰذا اس کی شہادت ازلی حیثیت رکھتی تھی۔

اور چونکہ یاسمین کی محبت میں بھی ازل کا ایک کیف تھا لہٰذا اس

رسم کی ادائیگی کے بعد وہ شکست نہیں کھا گئی تھی بلکہ اس کی حالت

کچھ ایسی ہوئی تھی جو دوبارہ حسن عطا ہونے کے بعد کسی عہد میں زلیخا

کی ہوئی تھی کہ وہ یوسف کنعان کو ایکدم سے نظر انداز کر گئی تھی اور

حسن عطا کرنیوالے کی طرف بھاگ رہی تھی۔ اور یہاں یاسمین کا رکی

طرف بھاگ رہی تھی اور چونکہ ہم آخرش انسان ہی تھے لہٰذا ہمارے
قدم لغزش میں آ گئے تھے۔
"یاسمین اس قدر جلدی بھی کیا"، ہم نے بھاگتی ہوئی یاسمین کی کلائی
پکڑ لی تھی "اس رسم کی ادائیگی کے بعد کچھ دوسری رسم کی ادائیگی
بھی ضروری ہو جاتی ہے۔ آؤ لگے ہاتھ وہ بھی ادا ہو جائے"
"کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔ آئیے وہ رسم ہم کار پر ادا کرتے ہیں"
اور وہ ہمیں کھینچکر کار پر لے آئی تھی۔
اور ہم کار پر بیٹھے ہی تھے کہ کار ایک جھٹکے سے اسٹارٹ کر دی گئی تھی اور
ہم چلے جا رہے تھے۔ اور اسی سمت جا رہے تھے جس سمت سے آئے تھے۔
یاسمین کی خوشی کی اس وقت حد نہیں تھی وہ کار چلا رہی تھی اور پھول سے
لدی ہوئی کسی نازک ٹہنی کی طرح جھومتی جا رہی تھی اور راہ میں وہی دشت
ودر، باغ وراغ اور گلزار و گلستاں حائل ہو رہے تھے۔ وہی منور کلیسا
مکانات، اشجار واشمار پے درپے چلتی تصویر کی طرح آنکھوں کے سامنے
رقص کرتے ہوئے پردے پر غائب ہوتے جا رہے تھے۔ وہی ساحل سمندر اور
اور سنہرے ریت اور پھر ان پر رقص کرتی ہوئی چاندنی آگے سے آ رہی تھی
اور پیچھے کی طرف چلی جا رہی تھی۔ سمندر میں طلاطم پیدا ہو چکا تھا اور یاسمین
کار چلا رہی تھی اور اسٹیئرنگ سے آتی ہوئی صدائیں میری سماعت سے ٹکرا
رہی تھیں۔

"اب احتیاط لازم ہے" وہ شاید مجھ سے کہہ رہی تھی "پھر جو

کبھی آپ نے غلط روی اختیار کی تو آپ کی خیر نہیں"۔

اور وہ ہنسی میں غلطاں و پیچاں تھی۔

اور ہمیں ایسا معلوم ہو رہا تھا یہ باتیں یاسمین نہیں کہہ رہی تھی بلکہ اسکا پاپوش پہنے کوئی فرشتہ کہہ رہا تھا اور ہم اتنا ہی سوچ سکے تھے کہ موڑ کاٹتے ہوئے ایک ہیئر پن بنڈ (HAIRPIN BEND) پر کچھ بات رونما ہو گئی تھی۔ صرف اتنا یاد ہے کہ ہم گر رہے تھے۔ اور پھر ایک شدید جسمانی تکلیف محسوس ہوئی تھی لیکن اس کے بعد کیا ہوا اس کا ہمیں کوئی علم نہیں۔ البتہ ایک تین ٹن کی گاڑی کے پچھواڑے سے جب ہمیں اسٹریچر پر لاد کر شہر میں ہسپتال کے آگے اتارا گیا تھا اور ایک دنیا تماشائی تھی اور دوسرے اسٹریچر پر یاسمین کو ڈالا جا رہا تھا تو ہمیں یقین آیا تھا کہ ہمارے ساتھ ضرور کوئی حادثہ پیش آیا ہے اور یہ سوچکر پھر دہی خود فراموشی کا عالم طاری ہو گیا تھا۔

اور جب ہم اور یاسمین ہسپتال سے نکلے تھے تو ہم نے یاسمین کے رخسار پر ایک باریک ترچھی لکیر دیکھی تھی جیسے شیشے پر ترچھا سا بال آگیا ہو اور پتہ چلا تھا وہ کوئی خطِ عارض نہیں بلکہ اس حادثے کا ایک زخم تھا جو اس وقت مندمل ہو چکا تھا لیکن ایک مہرِ الفت کے طور پر ایک مستقل نشانی چھوڑ گیا تھا۔ وہ خطِ عارض میرے لئے بیحد فریفتہ کن اور جاذب نظر تھا اور اپنے سر سے لے کر پیر تک اتنے ہی زخم آئے تھے اور اسقدر چرکے لگے تھے کہ انکا کوئی حساب نہیں تھا اور پھر پسلیاں ٹوٹ کر جو سینہ شگاف ہوئے تھے کہ دیکھنے والوں کو عبرت ہوتی تھی۔ اور یہاں زخموں کے افراط سے محبت کی روایت

زندہ کر گئے تھے اور یاسمین کے چہرے کے خط سے اب تو سدا پھول ہی پھول جھڑتے تھے ۔

"تم نے امتحان اور آزمائش کی قربان گاہ خوب ڈھونڈ نکالی تھی" ہم نے یاسمین کی طبیعت کا امتحان لیا تھا "کوئی تیاری نہیں اور اس مہم میں نکلے تھے ۔ آج تم نے جان بخشدی ۔ آئندہ کے لئے احتیاط ۔ پھر جو تمنائیں دل میں اٹھیں تو ساعت کی عظمت اور ان کی ہلاکت سامانیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے دل و دماغ کو کافی تیار کر لیا جائے اور پھر سر بکف اور کفن باندھے ہوئے اس جانب رجوع کیا جائے ۔ اور دیکھنا فی الحال تم اس خطِ عارض کو ذرا سنبھال کر رکھنا"

"آپ مجھے کیا نصیحت کرتے ہیں"، یاسمین نے بھی نہایت جچا ہوا جواب مرحمت کیا تھا "آپ اپنے پہلو کی جراحتوں کی خبر لیجیے اور اپنے اس حضرتِ دل کو سمجھایئے کہ محبت میں عجلت خالی از خطر نہیں"

١٨

بَرق شخص :-

مغربی ممالک کے بشیتر ملکوں میں بہار کی رُت مختصر لیکن نہایت دلکش اور مسحور کن ہوتی ہے۔ گلوب کے جس عرض البلد اور طول البلد پر ہم پناہ گزیں تھے اس کے قطع نظر اور اپنی حالت کے پیشِ نظر دلکشی اور دلفریبی کا ذکر کیا۔ ہم صرف اسی قدر سوچنے پر اکتفا کرتے تھے کہ قیامت کی برف باری اور سردی اب رخصت ہو چکی ہے اور ہمیں گویا نجات ملی ہے۔ عذابِ کبریٰ سے کہ دن رات انگیٹھی کے آگے پاکیزگیِ طبع اور انشراحِ قلب کے ساتھ گڑگڑانا پڑتا تھا اور سردست ہاتھ جوڑنا پڑتا تھا۔ دفتر ہو کہ بستر کوچہ ہو کہ بازار دن رات تپسیائیں کرنی پڑتی تھیں۔ نوبت یہاں تک آتی تھی کہ خیر سے کسی رات کو جو ڈیزل ختم ہوئی اور پائپ کی انگیٹھی سرد ہونے کو آئی کہ خیر نہیں ہوتی تھی، چیر بیخ، ٹیبل حتیٰ کہ الماریوں تک کی جو رفتہ رفتہ نذرِ آتش ہونے لگتے تھے اور ایک ایک

دو دو کر کے اپنے فرنیچر روز بروز فہرست سے گھٹتے جا رہے تھے، پھر آفس
اردلی کی فہم و فراست بھی قابل داد تھی کہ وہ احتیاط سے کام لیتا تھا کہ شب کی
تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انگریز افسروں کے "مس" کلب، یا کینٹین
اسٹور ہی سے اس قسم کے قیمتی اینڈھن فراہم کرتا اور دروغ برگردن راوی
اس سے جو دریافت کرتے تو وہ برجستہ کہہ دیتا کہ وہ بکے اور منسوخ شدہ سامان
ہیں۔ اور ایک دن صبح کو بیوقوفی کا مظاہرہ دیکھنے میں آیا تھا کہ کسی بڑے درجے
کے احمق فوجی افسر کی سرکردگی میں بیرکوں کی تلاشی لی گئی تھی اور گھنٹے
بھر کی کدوکاوش کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ تلف شدہ فرنیچر کو بدرجہ مجبوری "رائٹ
آف" کر دیا گیا تھا۔ اور پھر آنکھوں کے آگے ایک مضحکہ خیز سین پھر گیا تھا کہ
کلب اور مس کے خدمت گذار ویٹر حضرات اپنی سستی و وفاداری کے صدقے
بستر اور آسایش کے سارے ساز و سامان سمیت فرنیچر کے "غبن" کے سلسلے
میں تعزیراتی قواعد کرتے نظر آئے تھے۔ اور ہنسی کی بات نہیں عبرت کا مقام تھا
اور یہ ساری بات درحقیقت اسی آفس اردلی کی طبع رسا اور شر انگیز فہم و
فراست کی ایک شاہکار تھی، اور قطع نظر اس کے ہم سوچتے تھے کہ ان کو اس
قسم کے قواعد اور ورزش سے نقصان تو کیا ہوتا کچھ فائدہ ہی تھا کہ رگ پٹھے
انگریز افسروں کے سایۂ عاطفت میں رہ کر سست و مضمحل ہو چلے تھے اور
اب قدرتی طور پر انسدادی کارروائی ہو رہی تھی کہ اس طرح ان میں کچھ چستی
تیزی اور کچھ توانائی بھر دی گئی تھی۔ اور ظاہر ہے یہ سارے محض موسم کی
ناسازگاری کے کرشمے تھے۔ اسطرح تو ایک طویل عرصہ گذر گیا تھا اور تنگ

آ گئے تھے کہ ایک دن ناگہاں فضا میں مستی چھا گئی تھی اور ایک بیک بہار
آ گئی تھی۔ سہانا سہانا وقت تھا دل مسرت سے جھوم اٹھا تھا اور لبوں
سے خوشی کے ترانے نکلے تھے۔ تڑکے اٹھے تھے اور نکل پڑے تھے۔ سیر کی
دھن میں ماؤنٹ پاولو MOUNT PAVLOS پر جا پہونچے تھے اور اس
کی چوٹی پر پہونچ گئے تھے۔ اور کوہ پیمائی پر غور کر رہے تھے کہ بڑے بڑے
کوہ پیماؤں کے کارنامے تو خیر آج کی باتیں ہیں۔ اول اول تو انہوں نے ایسی
ہی مشقیں فراہم کی ہوں گی اور انہوں نے کچھ اسی قسم کے پہاڑوں کو اپنا ہدف
بنایا ہوگا۔ پاؤں سدھے ہوں گے اور رفتہ رفتہ بڑے بڑے برف سے
ڈھکے پہاڑوں سے نبرد آزما ہوئے ہوں گے اور بالآخر ہمالین ایکسپیڈیشن
میں مدعو کئے گئے ہوں گے۔ پھر ہم غور کرتے اس برقِ تجلی پر جس کی آماجگاہ
کوہ سینا بنا تھا، اور خیالات کے تانتوں میں بندھے آپ سے گذر جاتے
اور پرواز کر جاتے اس دنیا سے اور نظامِ شمسی، نجمی، کہکشانی اور سحابی سے
پرے ہی جا کر دم لیتے۔ لیکن وہ برق کہاں؟ وہ برق نہیں ملتی تاہم ہم نے
ماؤنٹ پاولو پر جانا ترک نہیں کیا تھا اور خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ ایک نہ
ایک دن ہم اسے ضرور تسخیر کر لیں گے۔

زمستانی ہوائیں تھیں نہیں لہٰذا ان کی شمشیر کی تیزیاں بھی نہیں تھیں چنانچہ
ہم نے اپنی دیرینہ عادات بدل ڈالے تھے اور علی الصباح روزمرہ کلیہ بھی
معمول ہوتا کہ ہم ماؤنٹ پاولو پر جاتے اور مرغزاروں کی سیر کرتے ہوئے
لوٹ جاتے۔ ایک دن علی الصباح جو ہم ماؤنٹ پاولو سے لوٹ رہے تھے

سورج ہنوز پردہ افق میں تھا۔ جب مرغ زاروں سے گذرے تھے تو دیکھا تھا ایک برقِ متشخص ایک برق رو حسینہ سبزہ زار پہ گرے ہوئے شبنم کے موتی لوٹ رہی تھی۔ دیکھنے میں شاید غلطی ہوئی تھی۔ وہ دراصل شبنم سے تر کردہ ہاتھوں کو لب و رخسار اور جبیں پر مل رہی تھی۔ نادانی یہ سرزد ہوئی تھی کہ پوچھ بیٹھے تھے کہ کیا ماجرا ہے، اسنے گھبرا کر جو مڑ کر دیکھا تھا تو ہم تھے اور پھر اس نے سوال کر ڈالا تھا "آپ" اور ہمیں اعتراف کرنا پڑا تھا کہ ہم ہم ہی تھے اور ہم نے دیکھا تھا اور ہمیں یقین کرنا پڑا تھا کہ وہ برقِ متشخص کوئی فرشتہ نہیں بلکہ یاسمین تھی۔ پہلی نظر میں تو وہ شرمندہ ہو گئی تھی لیکن اس شرمندگی پر طبیعت کی تیزی اور بے ساختہ پن جلدی ہی غالب آ گئی تھی۔

"تم ان باتوں کو کیا سمجھو۔ مے ڈیو MAY DEW سمجھتے ہو؟" اسنے جلدی سے سوال کر ڈالا تھا۔

"مے ڈیو یعنی مے کی شبنم ہوئی!" ہم نے مختصر جواب دیا تھا۔

"وہ تو ہوئی لیکن کسطرح؟" اسنے مکرر سوال کیا تھا

"یہ مے کا مہینہ ہے" ہم نے پتلون کی جیب سے سگریٹ نکالتے ہوئے جواب دیا تھا "آج اس کی پہلی تاریخ ہے لہذا آج کی شبنم ہوئی۔ اس میں سمجھنے کی کیا بات رہ گئی؟

"اس کے فوائد؟" اس نے مزید سوال کر ڈالا تھا

ہم تو جانتے بھی نہیں تھے کہ اس کے کچھ فوائد بھی ہوتے ہیں لیکن یاسمین چونکہ خود ہی کہہ رہی تھی لہذا معلوم ہو گیا تھا۔

"اس کے بیشمار فوائد ہیں" ہم نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہہ دیا تھا۔

"پھر ان کی کچھ تشریح ہو جائے؟"

اور یہاں متخولین کی کچھ تشریحات سے کسی قدر استفادہ کیا گیا تھا

"جب نسیم سحر کے ہلکے ہلکے جھونکے چلتے ہوں" ہم نے تشریحات شروع کر دی تھیں "اور شبنم کے موتی سبزہ زار کی نرم و نازک پتیوں پر لرزتے ہوں اور پرتو مہر اپنی بے مہر شعاعوں سے انکی ننھی ننھی جانوں کو فنا کے اسرار سکھلانے کے درپے ہو اس وقت ان کے لرزتے ہوئے دلوں میں تمنائیں اٹھتی ہیں کہ کاش گل عذار اور صبیح رخسار دوشیزائیں ان کی دادرسی کو آن پہونچتیں اور ان کو اپنے دامن میں سمیٹ کر اپنی اماں میں لے لیتیں۔ پر آپ مجرد اور ابتک انہیں محض لب و رخسار تک ہی لگا پائی ہیں اور سورج نمودار ہوا چاہتا ہے، لہٰذا کچھ جانفشانی کی ضرورت ہے"

"آپنے وہ بیشمار فوائد نہیں بتلائے" پھر تو یاسمین نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا تھا۔ اور ہم سمجھتے تھے کہ یہاں اب مزید سوال کی گنجائش نہیں تھی لیکن جواب کے لئے ہنوز اصرار تھا پھر تو شاعرانہ نکتہ پیمائیوں سے احتراز کرتے ہوئے جو کچھ دیکھ رہے تھے اسی سے براہ راست نتیجہ اخذ کرتے ہوئے جواب دینا پڑا تھا۔

"صبح کی اس شبنم کا فائدہ یہ ہے" ہمنے سگریٹ کے پے درپے دو چار کش لیکر جواب دیا تھا کہ یہ اگر علی الصباح لب و چشم اور رخسار و جبیں پر لگ جائے تو یہ بینائی اور تاب و توانائی بخشتی ہے

رخساروں کو صبیح و ملیح بناتی ہے۔ جبینوں کو نور عطا کرتی ہے اور رفتہ رفتہ مزاج متوازن ہونے لگتا ہے اور مجملہ مختصر یہ کہ یہ حسن کو نکھار دیتی ہے، اس کے علاوہ اگر جوئے شیر میں نہایا جائے تو بہتر نتائج اخذ ہو سکتے ہیں!"

آپ کے اس جانب سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی خاموشی چھا گئی تھی۔ اس سے ہمیں سمجھنے میں آسانی ہوئی تھی کہ آج ہم امتحان میں فیل نہیں ہوئے تھے، لیکن خوش فہمی کا مقام نہیں تھا اسلئے کہ اس امتحان میں کامیابی اس لئے ہوئی تھی کہ مدعا علیہ کا مزاج اس وقت اپنے موقف پر نہیں تھا ورنہ کوئی بڑی بات نہیں تھی اگر ہمیں جوئے شیر کے نکالنے کا فریضہ بھی تفویض کر دیا جاتا۔ اور چونکہ اس وقت جذبات کا ایک سنگین موڑ درپیش تھا لہٰذا سلامتی کے ساتھ معرکے سے تخلیہ کرنا ہی قرین مصلحت نظر آتا تھا، چنانچہ رخصت ہو گئے تھے کہ یاسمین نے باآواز بلند روک دیا تھا۔

"ٹھہریئے۔ آپ اسطرح کیسے چلے جائیں گے!" یاسمین کا انداز خوشگوار نہ تھا۔۔

اور ہمیں ٹھہر جانا پڑا تھا لیکن یہ سراسر ایک زیادتی نظر آتی تھی۔

"مس محترم" ہم نے احتجاج کر دیا تھا "یوں تو ہم دونوں کے مابین فطرت کا کچھ نہ کچھ رشتہ ضرور موجود ہے لیکن معاف کیجئے گا وہ رشتہ شاید فی الحال مطلق العنانی کی مطلق اجازت نہیں

دیتا۔ لہٰذا ......"

"کیوں۔ یہ بھاگنے کی کیا ترکیب ہے؟" یاسمین ایکدم ہمارے مقابل تھی۔

"کیوں۔ خیریت تو ہے" ہم نے سوال کیا تھا۔ "کچھ رہزنی کا شوق تو نہیں؟"

"جناب والا۔ یہ یونان ہے ہندوستان نہیں" یاسمین نے جواب دیا تھا "لہٰذا آپ قدرتی طور پر ہمارے رحم وکرم کے مہمان ہیں۔ آپ جان رکھئے گا"

"اور اپنی بھی سرفروشی مسلّم ہے کہ جان جائے ہاتھ سے جائے نہ تت، یاد کیجئے گا مس محترم" ہم نے بھی سرفروشانہ جواب دیا تھا۔

"لیکن توبہ ہے آپ بھی آپ نے کچھ نہ سمجھنے کی جیسے قسم کھا رکھی ہو" اسنے نہایت غارتگرانہ انداز اختیار کیا تھا۔

"اگر تم ہی وہ بات مجھے سمجھا دو تو برا کیا ہے؟ ہم تمہارا احسان مان لیں گے" ہم بھی سیدھے منہ بات کسطرح کر سکتے تھے۔

اور یاسمین کسی قدر حیرت زدہ ہوئی تھی۔

"جائیے۔ اور قسمت پر ناز کیجئے۔ ورنہ اس مقتل سے اپنے تئیں صحیح وسالم نکال لے جانا اتنا آسان نہیں" یاسمین نے بڑی خاکساری کے ساتھ جواب دیا تھا۔ لیکن اسنے جو یہ جواب مرحمت کیا

تھا تو اپنے کو ہم غریقِ رحمت ہی سمجھ رہے تھے۔
لیکن کہاں؟ — یہاں زلفوں کے پیچ و خم میں اس طرح اسیر ہوئے
تھے کہ نہ بھاگنے کی تگوں نہ اقامت کی تاب تھی۔
"جی نہیں۔ میں اس مشہد سے ہرگز ہرگز گریز پا نہیں۔ آپ شوق
سے خنجر آزمائی کیجئے" ہم نے گردن خنجر سے لگا دی تھی۔
یاسمین نے پیشقدمی کی تھی اور ہمارے اوور کوٹ کا کالر تھام
لیا تھا اور ایک جھٹکے کے ساتھ سوال کیا تھا۔
"کیا تم افشائے راز کے بھی کبھی قائل ہو گے یا صرف پردے
پردے ہی میں محبت کا دم بھرتے رہو گے؟" اس نے الفاظ
سے زیادہ لہجے سے کام لیا تھا۔
اور چونکہ یہ محبت کا سوال تھا اور پھر اس قدر کہنہ اور دشوار
سوال تھا کہ آج تک بڑے بڑے اساتذہ اس کا جواب نہیں دے
سکے تھے اور پھر اپنی بساط کیا یہاں تو اس وقت دن ہی کو ستارے
نظر آنے لگے تھے۔
"مس یاسمین تم آج بچوں جیسی بات کیوں کر رہی ہو" ہم نے
کسی قدر پیس و پیش کے ساتھ جواب دیا تھا "اقرار باللسان کی
ضرورت ہی کیا۔ جبکہ آلِ آدم ازل ہی سے محبت کی ابلہی میں
گرفتار کئے گئے ہیں اور محبت کرنا ان کا ایک وظیفۂ خاص ہے۔
پھر تم نے مجھے اس سے مستثنیٰ کیونکر سمجھ لیا۔ تم یقین جانو ہم اُن

ابلہانِ محبت سے ایک ہیں جنہیں محبت کا مکمل دعویٰ ہے اور جن کو پتہ تک نہیں کہ ان کا دعویٰ کس بنیاد پر ہے۔ بے شک ہم محبت کرتے ہیں لیکن بخدا نہیں جانتے کہ وہ محبت کیا ہے اور مشکل یہ ہے کہ ہم اس محبت کو جھٹلا بھی نہیں سکتے کیونکہ ہم اسے متقرر محسوس کرتے ہیں اور حواس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن حواس شاید خطا پر ہیں۔ ہم آج تک یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ہم تمہاری کس چیز سے محبت کرتے ہیں۔ کیا ہم محبت کرتے ہیں تمہارے مادی جسم سے۔ یا اشکالِ محض یعنی تمہارے خدو خال سے، یا افعالِ طبیعی یعنی تمہارے حرکات و سکنات سے یا ایمائے محض یعنی تمہارے انداز و ادا سے، یا حرکتِ انفاس یعنی تمہاری زندگی سے یا احوال و مقامات یعنی تمہارے ماحول سے؟ ہم مطلق نہیں جانتے کہ اس محبت کی کیا صورت ہے؟ اس کا نشیمن کہاں ہے؟ اور وہ کس احوال میں متمکن ہے؟۔ کیا وہ تمہارے خدوخال میں جاری و ساری ہے۔ یا تمہارے جسم کے کسی عضو میں روپوش ہے، یا تمہاری زندگی کی بتوتج میں پنہاں ہے؟ پھر جسم کی محبت زندگی کی منکر ہے اور زندگی کی محبت جسم کی منکر ہے!۔ اور اس کشمکش میں محبت کا طایرِ لاہوتی پرواز کر جاتا ہے اور محبت کا دامن ہمارے ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔ پھر تم ہی بتا دو محبت کیا ہے؟

پھر سوسائیٹی کی واحد مستتم ظریفی ہے کہ وہ ایک غیر معروف شے کو معروف بناتی ہے اور کس دیدہ دلیری سے قوانین مادی کی بنا استوار کرتی ہے اور محبت کے طایر کو اسیر کرنے کیلئے قانون کتخدائی کی اختراع کرتی ہے اور باہمی محبت کی طرح ڈالتی ہے پھر ہمیں ہنسی آتی ہے پاپائے کلیسا کی دراندازیوں پر کہ وہ محبت کے اس عنقائے ناآشنا ہوتے ہوئے بھی جسارت کرتا ہے۔ رسم کتخدائی کی سلسلہ جنبانی کرتا ہے۔ اور رشتۂ الفت کی دامن بندی کرتا ہے۔ یہ باندھنے چھاندنے کی ترکیب بھی حد درجہ مضحکہ خیز ہے کیونکہ وہ کبھی اسطرح ان غیر مرئی جذبات کو رشتۂ الفت میں جکڑنے میں کامیاب نہیں۔ اور ہمیں ہنسی آتی ہے ان ابلہانِ محبت پر کہ وہ اس عمل سے ایک گونہ مطمئن نظر آتے ہیں چہ جائیکہ یہ عمل محبت کی صریحاً تردید کرتا ہے۔

"چنانچہ ہماری آگہی کے لئے اسی قدر کافی ہے کہ ہمارے لبوں پہ صدائے زنہار بلند ہو اور ہم بھول کر بھی محبت کا چرچا نہ کریں کیونکہ محبت ایک ماورائی تخیل ہے جس کی حدوں تک مادی جسم لے کر پہونچنا محال ہے۔ البتہ رسم دنیا اگر مرغوب خاطر ہے تو رسم دامن بندی ایک چیز ہے۔ لیکن اس کی بھی سلسلہ جنبانیاں ابلہ فریبیاں ہیں، کیونکہ یہ متقاربت جنسی کی سمت بندھنیں ہیں جہاں اسی شے کا فقدان ہے جس کا تم نے تمہید میں دعویٰ کیا تھا۔"

اور ادھر یاسمین کے چہرے کی ضوفشانی رخصت ہو گئی تھی اس کا چہرہ کمہلا گیا تھا اور اس کا فرشتوں کو گڑبڑانے والا حسن مرجھا گیا تھا۔ تاہم ایک انداز غالب تھا۔ جس میں میرے اضطراب قلب کا مکمل جواب موجود تھا۔ لیکن یہاں تو الٰہی کا کمال ہی کر دیا تھا۔ کیونکہ ہم آخر خاکی انسان ہی تھے سینے میں دل رکھتے تھے اور سر میں عقل رکھتے تھے۔ پھر تو ایسی منہ کی کھائے تھے کہ ضعف بشری کا مکمل مظاہرہ کر گئے تھے۔

"نہیں نہیں۔ یاسمین۔ کون دکھاں تمہارے صدقے۔ ہم پیار کی سولی پر خودکشی کرنے کو تیار ہیں ما۔ لیکن خودکشی کہاں کر سکتے تھے ہمنے تو بساطِ حسن و عشق کچھ اسطرح الٹ دی تھی کہ شیطان کی شیطنت خطا کر گئی تھی۔

اور تسلیم کرنا پڑا تھا کہ دل کی صحیح ترجمانی میں زبان کی کلما ہتھیار ڈال دیتی ہے۔ نگاہوں میں عاجزی ہویدا اور تکمر طے پر بچھاید گی مستلم تھی۔ اب اپنی باری تھی لہذا موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کی طبیعت کا تھوڑا سا امتحان لیا تھا۔

"آپ مے کو یمن کمجتی ہیں؟" ہم نے یاسمین سے استفسار کیا تھا۔ اور ادھر جواب کے بجائے ایک شرمندگی اور پشیمانی دامنگیر تھی نگاہیں جھک گئی تھیں گویا میرے بجائے اس جانب سے بحیثیت مے کو یمن کے سلامِ عقیدت پیش کیا جا رہا تھا۔

اور ادھر ایک عقلمندی یہ سرزد ہوئی تھی کہ پوچھ بیٹھے تھے۔

"امید ہے اب آپ کسی کی دل آزاری نہیں کریں گی ؟" اور اسنے قطع نظر میرے اس سوال کے جواب جو دیا تھا تو اپنی سرحد ادراک سے بعید نظر آتا تھا۔

"سمندروں میں کتنی ہی موجیں اٹھیں گی اور دریاؤں میں کتنی ہی روانی ہو گی،" یاسمین نے ہمیں سمجھا دیا تھا

"درحقیقت جذباتِ عالیہ اور رومانس کے محرکات میں دلفریبی اور دلکشی ایک ہی عمل ہیں جو سمندروں کی موجوں اور دریاؤں کی لہروں کے مرادف ہیں جنکے نہ تو وجود سے دریا اور سمندر میں کوئی ایزاد ہوتا ہے اور نہ ان کے عدم ہی سے کوئی کمی واقع ہوتی ہے لیکن یہ تموج متنقل صورتیں ہیں جن کے تھپیڑوں میں آکر کتنے ہی سفینے غرقاب ہوئے ہیں اور تشنہ گانِ عشق میں اپنی حالت اس پیاسے کی تھی جس نے حلق تر کرنیکے لئے دریا میں جست لگائی ہو اور سیراب موت مرنے سے پیشتر اسے بات سمجھ میں آگئی ہو کہ اسے دریا میں جست لگانے کی ضرورت نہیں تھی بلکہ لب ساحل سے ایک جرعۂ آب کی ضرورت تھی۔

"یاسمین یہ محبت کا چکر علانہ کبھی تم سے حل ہو گا نہ ہم سے لہٰذا آؤ ہم اور تم کچھ اور ہی باتیں کرتے ہیں،" ہم نے یاسمین کو سمجھایا تھا۔

"وہ کیا بات ہے ؟" یاسمین نے استعجاب کے ساتھ ساتھ مستعدی

کا بھی اظہار کر دیا تھا۔

"آؤ ہم اور تم دونوں ملکر رقص کرتے ہیں" ہم نے صلاح پیش کر دی تھی۔

"رقص۔ اور یہاں؟" وہ میرا منہ تکنے لگی تھی۔

"جی ہاں۔ رقص اور یہیں!" ہم نے تاکید کی تھی۔

اور ڈوبتے اور ابھرتے ہوئے دل سے ہم دونوں نے ایک انوکھا رقص شروع کر دیا تھا۔ اور غم کے کچھ کے کھایا ہوا دل پے در پے ہچکولے کھا رہا تھا۔ لیکن فن اور آرٹ کے لحاظ سے رقص کا پایہ اس قدر بلند تھا کہ اس کو دیکھنے کے لئے عالم لاحوت سے جوق در جوق ارواح اور فرشتے اتر آئے تھے۔ اور رقص کا اتار چڑھاؤ اس قدر نظارہ سوز اور طربناک تھا کہ یزداں غمگین اور فرشتے سوگوار ہوئے تھے۔ عرش و فرش ہلنے لگے تھے۔ اور ہم نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہم نے کتنے عرصے تک رقص کیا تھا۔ اتنا یاد ہے کہ ہم مصروف رقص تھے۔ اور دورانِ رقص میں ایک دفعہ بصارت اور پھر سماعت جواب دے گئی تھی اور آخر میں تو سارے حواس ظاہری جواب دے گئے تھے۔ پھر کیا ہوا اس کا ہمیں علم نہیں۔ البتہ ہم جب ہوش میں آئے تھے تو دیکھا تھا وہاں یزداں نہیں تھا، ارواح نہیں تھے، اور فرشتے نہیں تھے جو ہماری چارہ سازی کرتے۔ وہاں ایک اجنبی یونان کا ایک ضعیف و ناتواں باغبان نظر آیا تھا اور وہ اپنی خوئے جاں نثاری کے ملطے ہمارے حلق میں لیموں کی قاشیں نچوڑ رہا تھا۔ اور ہم نے یزداں کو پکارا تھا

لیکن اس نے ایک دفعہ بھی جواب نہیں دیا تھا، البتہ باغباں نے ہمیں کئی دفعہ
منع کیا تھا۔ اور چونکہ یاسمین کو پہلے ہوش میں لایا گیا تھا لہٰذا اپنی حالت کے
قطع نظر میرے احوال پر اشک کے انمول موتی لٹا رہی تھی۔ اور جاں نثار
باغباں اسے تسلی دے رہا تھا اور جب ہماری طبیعت کچھ سنبھل گئی تھی تو ہم
لوگ وہاں سے جوں توں رخصت ہو گئے تھے۔ لیکن طبیعت میں اب وہ جولانی
کہاں بالکل شکستہ قدم اٹھ رہے تھے اور قدم قدم پر پاؤں لغزش کھا رہے
تھے۔ دل کہہ رہا تھا کاش ہماری اس ٹریجڈی میں وہ آدم زاد حائل نہ ہوا ہوتا
اور ہم یزداں اور فرشتوں کی ذات کو کچھ دیر کے لئے ضرور جھٹلا سکتے تھے لیکن ہرگز
ہرگز اس جاں نثار باغباں کی ذات کو جھٹلا نہیں سکتے تھے کیونکہ وہ آدم زاد تھا اور
آدم زادوں کا شریک غم بن سکتا تھا اور یہ کچھ ایسا کام تھا جسے لاکھوں یزداں
اور کروڑوں فرشتے انجام نہیں دے سکتے تھے۔

۱۱ء

سیرِ گلستاں :۔

حالانکہ اس سوال کا کوئی جواب نہیں کہ آپ جیتے کیوں ہیں لیکن کچھ برخود غلط قسم کے لوگ چھوٹتے ہی کہیں گے کہ ہم حمد و ثنا کے لئے پیدا ہوئے ہیں اور تقدس اور پاکیزگی بیان کرنے کے لئے جیتے ہیں اور آپ دیکھیے لِلّٰہ وحوش و بہائیم کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں ــــ یہ تو وہی بات ہوئی کہ ہم چنیں دیگرے نیست حالانکہ یہ باتیں عقل کے احاطے میں نہیں آسکتی تھیں لیکن یہاں عقل پرداز پر مجبور رہے ۔ اور یہاں ہمارے ایک حضرتِ محترم تھے جو انسان ہی کی طرح جیتے تھے ۔ حمد و ثنا ان کی زندگی کی ایک ڈھال تھی اور آپ اس اہم ہتھیار سے مسلح ہو کر اپنی زندگی کسی سر فروش سورما کی طرح بسر کرتے تھے ۔ لیکن آپ رستم بے میداں نہیں تھے بلکہ کافی دم خم رکھتے تھے اور اپنے گرد و پیش ایک میدانِ عمل رکھتے تھے ۔ آپ شب و روز مصروف ہی مصروف نظر آتے تھے

اور دیکھا گیا تھا آپ جتنے بھی کام کرتے تھے اپنی ذات کے لئے کم اور فی سبیل اللہ زیادہ کرتے تھے۔ اور سب سے زیادہ خوش و خرم بھی نظر آتے تھے۔ حالانکہ آپ بہت زیادہ سخی اور کھلے ہاتھ قسم کے انسان نہیں تھے لیکن ایک دنیا آپ کی نیاز مند اور ارادت کیش تھی۔ اور ہر قماش اور ہر صنف کے لوگ آپ سے عقیدت رکھتے تھے۔ آپ راہ چلتے تو لوگ آنکھیں بچھاتے تھے اور ایک دنیا آپ کے حلقہ بگوش ہوتی تھی۔ اور یہ کچھ ایسی دولت تھی جو زر و گوہر اور املاک و اثاثہ سے کہیں بڑھ کر تھی۔ اور وہ تھی آپ کی ذات کی خاکساری اور صفات کی بلندی ۔ حالانکہ تسبیح و تحلیل آپ بھی کرتے تھے اور چرچ کی حاضری ہر اتوار کو آپ بھی دیا کرتے تھے حتیٰ کہ روزانہ وقتِ غروب سے لے کر ۹ بجے شب تک آپ کی فیملی کے لئے وقتِ عبادت ہی ہوتا تھا لیکن علاوہ اتوار کی اس حاضری کے یہاں اس روزانہ کی عبادت میں حصہ لیتے ہوئے نہ کبھی ان کو نہ کبھی یاسمین کو اور نہ کبھی ان کے فیملی کے کسی دوسرے ممبر کو دیکھا گیا تھا۔ اور حد یہ کہ منگل اور جمعہ کی شب کو بھی یہ وقت رائیگاں ہی جاتا تھا۔ البتہ ہر شام روح القدس کے آلٹر پر سرخ روشنی جلتی تھی اور بعد میں مرکری لیمپ کی روشنی سے حضرت کا خانۂ پرتکلف سیل نور بن جاتا تھا اور یہی اس خاندان کی عبادتِ شب تھی۔ آپ کہتے تھے زندگی کسی اعتقاد کا نام نہیں بلکہ یہ سرتاپا عمل ہے اور خالصتاً محبت کا ایک عمل ہے۔ اور چونکہ محبت فقط تخیل یا تصور کی کوئی چیز نہیں تھی اور محض دل میں ٹھان لینے کی چیز نہیں تھی بلکہ عملیات کی دنیا کی ایک چیز تھی۔ لہذا اس کے اثبات کے لئے فقط دلی

جذبات کا اظہار کافی نہیں بلکہ یہاں تو براہ راست لینے کے دینے اور دینے کے لینے پڑتے ہیں۔ اور پھر محبت کس قدر ہمہ گیر اور ہمہ صفت موصوف شئے ہے ــــ خدا سے محبت، بشر سے محبت، جامعۂ بشری یعنی عالم انسانی سے محبت، وطن سے محبت۔ مرد سے محبت، عورت سے محبت۔ اور پھر مرد اور عورت میں محبت!۔ اور پھر یہ جتنی ساری محبتیں ہیں سب کی سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے اور ایک ہی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ اور قدرت نے اس سلسلے کو کچھ اسطرح ایک نہ ٹوٹنے والے رشتے میں منسلک کر رکھا ہے۔ اور اس سے عالم ہستی کے جملہ اجزائے پریشاں کو اس طرح جکڑ رکھا ہے کہ اس ہمہ گیر زنجیر سے اگر ایک بھی کڑی نکل گئی تو زنجیر کام کی نہیں۔ اور چونکہ محبت کرنا انسان کا پیدائشی حق ہے، پھر تو یہ نعمت کوئی کسی سے چھین بھی نہیں سکتا ہے۔ چنانچہ اعلیحضرت جہاں ہم سے بے پناہ محبت کرتے تھے وہاں وہ ہمیں بے پایاں محبت کرنا بھی سکھاتے تھے۔ اور وہ تو محبت کا ایک عالم گیر تخیل تھا۔ اول اول تو ہم اسی محبت سے چلے تھے لیکن رفتہ رفتہ وہ محبت ہماری اور یاسمین کی ذات میں محدود ہو کر آلیس کی محبت میں منتقل ہو گئی تھی اور وہ محبت تبدریج اس قدر سمٹی سمٹائی تھی اور اس درجہ تنگ داماں ہوئی تھی کہ اب تو زندگی کا توازن ہی بگڑنے لگا تھا۔

حالانکہ یاسمین بھی ابتک یونیورسٹی سے ڈگریاں حاصل کر چکی تھی اور اور اپنے پاس بھی ڈپلوما، اور ڈگریوں کی کمی واقع نہیں ہوئی تھی اور اللہ کی دی ہوئی عقل بھی ہمارے حصے میں برابر برابر کی آئی تھی لیکن خدا لگتی

بات یہ تھی کہ ہم اس عقل سے کام ہی نہیں لے رہے تھے ۔ یوں تو یاسمین خوش گفتاری میں بلبلِ ہزار داستان کی طرح چہک سکتی تھی اور علمی و ادبی معرکوں میں ایک سے ایک ہاتھ کی صفائی دکھائی سکتی تھی۔ اور ادھر بھی اللہ چاہے تو خیالات کی فلک پیمائیوں میں زمین کے قلابے آسمان پر جا ملا سکتے تھے اور تخیل کے بڑے بڑے قلعے تعمیر کر سکتے تھے ۔لیکن ہم لوگوں پر وہی مثال صادق آتی تھی کہ جنگل جنگل گھومے لیکن ڈھاک کے تین ہی پات نظر آئے ۔ مثلاً ہم ہمیشہ سر جوڑ کر بیٹھتے تھے اور وہی ایک بات نظر آتی تھی ۔یعنی کہ وہی ایک ہم اور وہی ایک یاسمین اور ایک دنیا نہیں تھی ۔ اور فضول فضول باتیں سوچتے تھے لیکن کبھی یہ نہیں سوچتے تھے کہ زندگی آخر زندگی ہی ہے اور وہ ایک حقیقت ہے اور حقیقت کبھی پیچھا نہیں چھوڑتی ۔ لہٰذا اس میدان میں ذرا سنبھل کر ہی قدم اٹھایا جائے ۔ لیکن نہیں بھ

حالانکہ یاسمین سے حضرت کو فطری محبت تھی اور ہم سے دیرینہ الفت تھی لیکن کھری بات یہ تھی کہ حضرت شادی کے سلسلے میں ذرا گھبراتے تھے اور کچھ باتیں چھپاتے تھے جن کا ہمیں براہِ راست کوئی علم نہیں تھا ۔لیکن یہ طے شدہ بات تھی کہ آپ کے نزدیک محبت کا انجام شادی نہیں ہو سکتی تھی ۔ اور یہ بات بالکل صاف تھی ۔ حالانکہ اگر ہم چاہتے تو ہم لوگ بھی اپنی محبت کو توڑ موڑ کر شادی میں منتقل کر لے سکتے تھے ۔ اور ایک دن ایک سہانی صبح حضرت کو بھی پتہ چل جاتا کہ ہماری شادی ہو گئی ہے ۔لیکن سچی بات یہ تھی کہ ہمارے قدم سے وے گر اسی جانب نہیں اٹھ رہے تھے ۔ اور اصول کی رو سے یہ بات کچھ حضرت ہی پر

موقوف نہیں تھی یہاں تو اولاد کی شادی کی درحقیقت والدین کو کبھی فکر ہی نہیں ہوئی تھی اور اس سلسلے میں کچھ سوچنے کو بھی وہ حماقت ہی کہتے تھے۔ چنانچہ اس قسم کی بات کبھی آئی تو حضرت یا تو ناک چڑھا لیتے تھے یا پھر بھوں سکیڑ لیتے تھے اور اس قسم کی بات کرنے والے کو پرلے درجے کا احمق اور نالائق اور پھر اس قسم کی باتوں کو سراسر لغو اور بالکل مہمل کہتے تھے۔ مثلاً آپ یہ کہتے تھے کہ لڑکے کے لئے بیوی ڈھونڈھنا اور لڑکی کے لئے شوہر تلاش کرنا حد درجہ شرمناک بات ہے اور یہ بات مضحکہ خیز بھی نظر آتی تھی اس لئے کہ حضرت کی میڈم کے ساتھ کسی زمانے میں جو شادی ہوئی تھی تو آپ کے والدین نے آپ کے لئے میڈم کا انکشاف نہیں کیا تھا، بلکہ حضرت نے خود اپنا چراغِ رخِ زیبا لیکر میڈم کو ڈھونڈ نکالا تھا اور ان کو ان کے حریمِ ناز سے نکال کر اپنے خلوت خانہ دل میں پناہ گزین کیا تھا اور بات معقول نظر آتی تھی۔ آپ کو کیا ضرورت تھی کہ آپ ازمنۂ وسطہ کے پرفن والدین کی طرح اولاد کی شادیاں کرتے اور لاتہذیبی کی ایک محبت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی حماقت کا کلہاڑا ان کے پیروں پر مارتے اور ان کی زندگی کو مفلوج بنا کر ان کی ساری ضروریاتِ زندگی تاعمر اپنے دوشِ دگردن پر اٹھاتے چلتے اور پھر یہ بات سو فیصدی درست نظر آتی تھی کہ اولاد کو قطعی حق نہیں پہونچتا کہ وہ والدین کی کسب پر دائم متصرف رہے اور ازمنۂ وسطہ کے نامطلوب فاتحین کی اولاد کی طرح تنعم اور تعیش کی فضا میں ہاکو جیسے نامطلوب سورماؤں کی زندگی بسر کرتی رہے، کیونکہ یہ ساری بات قانونِ فطرت کی کھلی خلاف ورزی تھی!۔

ہر چند اعلیحضرت کی باتیں سو فیصدی کام کی تھیں اور یقیناً ہمارے
فائدے کی تھیں لیکن چونکہ ہم ایک بہار ناز کے مارے ہوئے تھے یہاں ہر سو
سبزہ ہی سبزہ اور گلستاں ہی گلستاں نظر آتا تھا۔ اور صاحبزادی کا یہ عالم تھا کہ دن
رات کے بیشتر اوقات آئینے کے سامنے ہوتیں۔ اور اپنا امتحان لیتی ہوتیں۔ ہر
رخ اور ہر زاویہ سے اپنے کو جانچتی ہوتیں، سر سے لے کر پیر تک، دامن سے لیکر
گریباں تک، بال سے لے کر ناخن تک۔ اور چوٹی سے لے کر ناخن تک اپنا
معائنہ کرتی ہوتیں۔ ایک ایک پوز سے، ایک ایک انداز سے اپنا جائزہ لیتی
ہوتیں۔ اور ایک ایک رخ اور ایک ایک پہلو سے اپنے کو ٹھیک ٹھاک اور درست
کرتی ہوتیں۔ بال بال موتی پروتیں اور خال خال آراستہ و پیراستہ نظر آتیں۔
اور اپنے پس و پیش اور ارد گرد برق گراتی اور آگ لگاتی نظر آتیں۔ کبھی
سنہری زلفوں کے گرد سفید ربن کا حلقہ نظر آتا۔ کبھی زلف کی لٹیں چہرے پر
اڑتی نظر آتیں۔ اور کبھی گون، فراک، اور نگلیجیوں کی آڑی ترچھی کٹنگ
عقل پر پتھر برساتی نظر آتیں۔ اور یہاں ہر گھڑی ایک نیا فتنہ اور ہر لمحہ ایک
مستقل خطرہ درپیش ہوتا۔

اور ایک دن آخر ہماری سمجھ میں بات آگئی تھی کہ یہ زندگی زندگی نہیں بلکہ
مسلسل ایک فریب زندگی ہے اور ہمیں ضرورت تھی زندگی کو ٹھوس بنیاد پر
رکھنے کی۔ اور پھر ساتھ ہی ساتھ واقعات نے بھی کچھ اسطرح بے قاعدہ
کروٹ لی تھی کہ صاف قدرت کا کرشمہ نظر آگیا تھا اور یہاں تو ہاتھ کے
طوطے اڑ گئے تھے۔ اور پاؤں تلے کی زمین نکل گئی تھی۔ اور بعد میں پتہ

چلا تھا کہ اگر عشق بازی یہی تھی تو ہماری کم سے کم سزا بھی یہی تھی!۔

۱۲

ایک المیہ:۔

۱۹ر جنوری ۱۹۷۶ء کا دن ایک ٹریجڈی کا دن تھا۔ اور اس ٹریجڈی کی ایک زندہ مثال آج ہم تھے اور ہمیں اک گونہ حیرت ہوئی تھی کہ ٹریجڈی کی خبر لے کر ہم گئے تھے۔ لیکن یہاں یاسمین مکمل ٹریجڈی بنی کھڑی تھی۔ اور کہنے کی بات نہیں یہ سراسر قدرت کی ستم ظریفی نظر آتی تھی کہ وہ عین اسی مقام پر کھڑی تھی جہاں سے اس نے روزِ اوّل ہمیں کیمسٹ کی دکان کا پتہ بتلایا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر ہمارا دل تڑپ گیا تھا۔ زبان سے بے محابا نکل گیا تھا۔

"نہ جانے آج میں سب کچھ بھول کیوں رہا ہوں لہٰذا یاسمین، تم آج بھی مجھے کیمسٹ کی دکان بتلا دو۔"

یاسمین نے تو پہلے مجھے نڈھال مضمحل اور متوحش دیکھ کر یہ سمجھا تھا کہ میں نشے میں ہوں اور اسے حیرت ہوئی تھی۔ لیکن اس کے چہرے پر

حیرانی اور پریشانی کے جو آثار نمایاں تھے وہ مقرر ایک درد نہانی کے
مظہر تھے اور وہ حیران و پریشان میرے ساتھ ساتھ کیمسٹ کی
دکان میں داخل ہو گئی تھی۔ ہمارے ذہن پہ روز اوّل کے سارے
حادثات کے نقوش یکے بعد دیگرے ابھرنے لگے تھے اور اگرچہ
ہم حوصلہ اور پامردی سے کام لے رہے تھے اور ہم نے دل پر پتھر رکھ
لیا تھا تاہم ہمیں ایک گلاس بھر پانی کی سخت ضرورت پیش آ گئی تھی
اور ہماری دگرگوں حالت کو ملحوظ رکھتے ہوئے جلدی جلدی ایک گلاس
پانی جو لایا گیا تھا تو ہم کرسی کا سہارا لے چکے تھے اور ہماری زبان سے
غیر ارادی طور پر کچھ فقرے ادا ہو گئے تھے۔
"یاسمین کیا آج بھی ہمارے لئے اسپرین کے ٹکیے نہیں؟" اور
پیشتر اس کے کہ آج یاسمین ہمارے لئے اسپرین کے ٹکیے لاتی ہم پانی
کا گلاس خالی کر چکے تھے۔ پھر طبیعت کسی قدر ٹھکانے لگی تھی۔
اور پتہ چلا تھا دل کے ارفع اعلیٰ اور پاکیزہ جذبات جو باطنی
ذرائع سے متمتع تھے کسی حد تک مادی وسائل سے بھی متاثر تھے۔
"یاسمین" ہم نے سلسلۂ کلام کا آغاز کیا تھا "انسان جو کچھ چاہتا
ہے وہ ہوتا کیوں نہیں۔ وہ چاہتا کیوں ہے اور ہوتا کیوں نہیں۔
چاہنے کی دلیل کیا اور ہونے کا جواز کیا؟ ہم دیکھتے ہیں ہم اور تم
نے ایک دوسرے کو کسقدر چاہا ہے۔ جہاں تک چاہنے کا تعلق ہے
وہ اپنی جگہ پر کس قدر صحیح، مستحکم اور غیر متزلزل ہے لیکن اس چاہت

ے ایک قدم آگے کچھ بھی صحیح نہیں۔ یہ آخر کیوں؟ ۔ موسم بہار کے
جاذبِ نظر پھول ہمیں للچاتے ہیں اور ہماری آتشِ شوق کو بھڑکاتے
ہیں۔ ان کی خوشبو، رنگینی اور تروتازگی میں ایک مقناطیسی کشش
ہے۔ یہ پھول ہمارے دامنِ دل کو کھینچتے ہیں اور ہم دیوانہ وار انکی
طرف بڑھتے ہیں اور ان کو توڑ لیتے ہیں۔ لیکن درحقیقت وہ پھول
زیبِ چمن ہی خوشتر ہیں، اس لئے کہ ان کو توڑ کر ہم جو اپنانے
کی کوشش کرتے ہیں تو وہ مرجھا جاتے ہیں اور اپنی تمام سحر آفرینی کھو
دیتے ہیں ــــــ یہ آخر کیوں؟"
"لیکن نصیبِ اعدا آپ اس قدر پریشان کیوں ہیں، اور یہ کیا انداز
ہیں اور آخر آپ یہ قصہ کیا لے بیٹھے؟"
یاسمین نے کسی قدر بے دلی کے ساتھ نکتہ چینی کی تھی۔
"یوں ہمیں پریشان نہیں ہونا چاہیئے" ہم نے مجروح جذبات کو کسی
قدر ساکن کیا تھا۔ "لیکن دل میں کچھ خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ ہم
اکثر یہ سوچتے ہیں کہ ہم ٹھہرے ایک ابن السبیل خانہ بردوش اور صحرا
نشیں اور نہ جانے لوگ ہمیں خانہ ساز اور ایک نکتۂ ساکن کس طرح
تصور کرتے ہیں۔ ورنہ اپنے زعم میں تو ہم اپنے کو نفی کے برابر
سمجھتے ہیں۔ اور تمہاری نظرِ عنایت کا کیا کہنا کہ تم نے ایک وہمِ محض کو
حقیقت کے جامے میں دیکھا۔ یہ تمہارا فریبِ نظر ہے ورنہ درحقیقت
یہ بھی کچھ غلط ہے"۔

"یہ فلسفہ اور منطق کی باتیں ہیں"، یاسمین نے اسی بے دلی سے جواب دیا تھا۔ "اور وہ اپنی جگہ پر ہیں۔ لیکن آپ کے حرکات و سکنات اور طرز کلام سے یہ مترشح ہے کہ آپ مجھ سے ارادتاً چند باتیں چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بھلا یہ کیوں؟ اور باوجود اس کے کچھ باتیں خود بخود افشا ہوتی جا رہی ہیں۔ لیکن کیا افشائے راز اخفائے راز سے بہتر نہیں؟"۔ یاسمین کے لبوں پہ ایک غمگین سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

"یاسمین"، ہم نے اعتراف کیا تھا "میں دراصل تم سے کوئی بات چھپانا نہیں چاہتا، اس لئے کہ مجھے تم پہ مکمل بھروسہ اور کامل یقین ہے۔ اور ہمارے تمہارے درمیان ایک عرصے کے میل جول سے جو ایک رشتہ پیدا ہو گیا ہے وہ دراصل تعاون ہی کی ایک صورت ہے۔ لہذا ہمارے اور تمہارے درمیان تعاون ہی اصل چیز ہے"

"تعاون کی تو البتہ میں دلدادہ ہوں"، یاسمین نے میری تائید کی تھی اور اپنی خستہ دلی اور روشن ضمیری کا ثبوت پیش کیا تھا۔ "لیکن مجھے حیرت ہے کہ آپ مجھ سے اس خبر کو کیوں چھپا رہے ہیں کہ آپ ہمیں عنقریب داغِ مفارقت دینے والے ہیں۔ یہ خبر اتفاقاً آپ کے یہاں پہونچنے سے پیشتر مجھ تک پہونچ گئی۔ آپ کا یہ کہنا بجا ہے کہ پھول زیبِ چمن ہی خوشتر ہیں۔ البتہ باغباں کو اختیار ہے وہ گل چینی نہ کرے بلکہ پھولوں کی نگہبانی کرتا رہے، لیکن پھول کی قسمت کو کیا

کیا جائے جبکہ اسے ایک دن یوں بھی مرجھا جانا ہے۔ اس صورت میں فلسفۂ محبت کے متزلزل ہونے کی کوئی قطعی دلیل بھی نہیں۔ بھلا یہ میں کچھ غلط کہہ رہی ہوں؟"

"اور مزید براں واضح رہے" یاسمین نے مزید شعاع ریزی کی تھی "کہ میں فطرتاً کسی قدر لاابالی اور غیر محتاط واقع ہوئی ہوں تاہم اصولاً میں تعاون کی شیدا اور دلدادہ ہوں اور مجھے خوشی ہے کہ آپ نے تعاون ہی کو حد واسطہ قرار دیا ہے"

"یاسمین" میں نے محتاط ہو کر جواب دیا تھا "تمہیں جو خبر ملی ہے وہ صحیح ہے لیکن ہمیں حیرت ہے کہ یہ خبر اس تیزی سے شہر تک کیونکر پھیل گئی درآنحالیکہ ہماری نقل و حرکت صیغۂ راز کی بات ہے اور اس راز کو عام طور سے اس قدر جلد افشا نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ بہر کیف یہ خبر درست ہے اور ہم تمہیں خود اس کی اطلاع دینے والے تھے"

"اور ایک بات سوچنے کی ہے" یاسمین نے تشریح کی تھی "آپ مجھے داغِ مفارقت کیوں دینا چاہتے ہیں۔ مان لیا آپ دے ہی گئے لیکن آپ خود بھی تو اس سے دامن نہیں بچا سکیں گے، آپ کے دامنِ دل پر اس کا ایک گہرا دھبہ آپ کے ہمراہ اپنے وطن کو جائے گا۔ اس سے پہلو بچانے کی کوئی ترکیب سوچی ہے۔ سوچی تو ہوگی ضرور آپ نے۔ بھلا مجھے بھی تو کچھ بتایئے!"

"یاسمین"۔ ہم نے جواب دیا تھا "اپنے لئے تو دامن بچانے کی ترکیب

اسی قدر باقی رہ گئی ہے کہ اس دامنِ دل کو اس آتشِ سوزاں کی نذر کر دیا جائے اور اسے اسمیں جلنے کے لئے چھوڑ دیا جائے کیونکہ وہ اسی کا سزاوار ہے اور ہم اور تم اس منظر سے آگے نکل چلیں، دور بہت دور! ۔ جراحتِ دل اور داغِ جگر کا ایک ایک ہدیہ اپنے اپنے دامن میں سمیٹ کر بہت دور نکل چلیں۔ اس وقت ہماری تحویل میں داغ اور جراحت کا نادر تحفہ لبطور ایک مہر الفت کے ہوگا جو کبھی مٹایا نہ جائے گا۔ اور یقین جانو وہ آگے چلکو عہد آفرینی کرے گا۔ زندگی کی اعلےٰ قوتوں کو بیدار کرے گا۔ زمان و مکان کو تسخیر کریگا اور ایک بار گی من و تو کا تفرقہ مٹا ڈالے گا،،

"پھر تو آپ اپنے دل میں اس تلخ تجربہ کے خاکستر میں پوشیدہ ایک چنگاری کے قائل ہیں اور محبت کے بھڑکتے ہوئے شعلوں سے گل بدامن ہونے کے بجائے محض ایک چنگاری پر اکتفا کرنا چاہتے ہیں،، یاسمین نے قطع کلام کیا تھا۔

"یاسمین ہم نے جواب دیا تھا" تم غور کیوں نہیں کرتیں ۔ تم اس چنگاری کو حقیر نہ سمجھو ۔ اس جسمِ خاکی کو آتش بدامن رکھنے کے لئے شعلوں کی نہیں بلکہ چنگاری کی ضرورت ہے ۔ شعلۂ بے محابا تو ایک آن میں زندگی کا پیراہن جلا کر خاکستر کر ڈالتا ہے اور یہ چنگاری سلگتی رہتی ہے اور تا عمر اپنی حرارت سے زندگی کو آتش بدامن رکھتی ہے،،

"لیکن ہم کمزور انسان ہیں،، یاسمین مضطرب ہوگئی تھی" اور ہم

محبت کے خام شعلوں ہی میں جلکر تمام ہو جانے کے خوگر ہیں۔ اور ہم اسی شعلے کے متمنی ہیں ۔ اب آپ یہ بتایئے یہ کیسا رہے، اگر ہم اپنے حدِ درد دل کا علاج شادی کے کڑوے گھونٹ سے کر ڈالیں، اس صورت میں ہم صداقت کا کچھ کچھ امتحان بھی کر سکتے ہیں، حالانکہ حالات مانع ہیں تاہم ہم عدالت کا سہارا لے سکتے ہیں اور علاوہ اس کے بہتیرے دوسرے وسائل بھی ہیں۔ بھلا آپ کی کیا صلاح ہے؟"

اور ہمارے پاؤں تلے کی زمین کھسکتی محسوس ہوئی تھی، ہوش خطا ہوئے تھے اور دامانِ خیال ہاتھوں سے چھوٹا جاتا تھا کہ یہ کیونکر ممکن تھا اور ہم اس مشفق و مکرم پاپائے محترم سے اس دنیا میں تو کیا دوسرے جہاں میں بھی غداری نہیں کر سکتے تھے ۔ انہیں منہ کیا دکھا سکتے تھے کہ بغیر ان کی رضامندی کے عدالت کے سہارے ان کی نورِ نظر سے شادی کر لیتے اور پھر ان کو لے کر ان کو اطلاع کئے بغیر فرار ہو جاتے ۔ استغفر اللہ کیا ترکیب تھی اور کس قدر بزدلی کی بات تھی۔ سخت حیران تھے۔ اور شادی کی منطق ہماری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اور ہماری سمجھ میں قطعی نہیں آ رہا تھا کہ میرے اور یاسمین کے درمیان شادی کی رسم کیونکر ضروری تھی۔ اور من ودست دو امانِ آلِ رسول ہم عرق ریز تھے کہ روزِ محشر شہیدوں کو منہ کیا دکھائیں گے ۔ سوچنے کی بات تھی صدق وسوز کی دنیا میں شادی کی رسم کو گھسیٹ کر آرزوؤں ارمانوں اور امنگوں کا گلا گھونٹ دینا، احساسِ لطیف کو پامال کر ڈالنا اور زندگی کی اعلیٰ قوتوں کو غارت کر ڈالنا اور محبت کے کھنڈر میں سرد

جذبات کا گھونسلا بنانا درحقیقت محبت کی دلیل نہیں۔ آج شادی کر ڈالنا کل گھونسلے کے لئے تنکے چننا اور اپنی عمر گراں مایہ کو زمین گیر اور زمین دوز کر ڈالنا، جذبات سلیم اور عنقائے محبت کو مجروح کر ڈالنا، علوم حیاتیات کی رو سے ایک شغل حیوانی ہے۔ شادی اس دنیا کی ایک کہنہ مشق ہے اور ایک خرافات ہے اور سراسر لاتہذیبی کے دور کی ایک پرانی یادگار ہے۔ جس سے الفت کا رشتہ استوار ہونے کے بجائے کمزور ہو جاتا ہے، کیا قدرت کے اس ضابطہ ناکتخدائی کے ناطے یہ بہتر نہیں کہ حسن و عشق کی اس لافانی حرارت کو سینوں میں محفوظ رکھا جائے اور اپنی ہستی کو شمشیر بے نیام رکھ کر اپنی خارہ شگن قوتوں سے استفادہ کرتے ہوئے پامردی کے ساتھ کہنگی کے دبیز پردوں کو چاک کیا جائے اور ایک حسنِ عالمگیر کو بے نقاب کیا جائے جس کو تاریخِ عالم بروئے کار لانے کے لئے کوشاں ہے لیکن وہ اس کا مجاز نہیں کیونکہ ایک درد و سوز جو ہم اپنے پہلو میں پنہاں رکھتے ہیں واحد شے ہے جو اس کے دامن میں نہیں۔

اور بے ساختہ ہماری زبان سے نعرۂ الحذر بلند ہوا تھا۔

"یاسمین۔ ہمیں زندگی کی تلخیوں اور صبر آزمائیوں کا عزم کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہیئے"، ہمارا زبان سے خود بخود نکل گیا تھا۔ حیف د صد حیف کہ ہمارے فکر و نظر میں یہ انحطاط اور عزم اور یقین میں اس قدر تنزل کہ ہم بزدلوں کی طرح مقتل سے مشہد مقدس سے اور میدان شہادت سے بھاگ جائیں! ہرگز ہرگز نہیں۔ خدا کو اور روح القدس کو منہ کیا دکھاؤ گی؟"

ہم شدید ذہنی کشمکش اور روحانی اضطراب میں مبتلا تھے جس کے آثار ہمارے چہرے پر بھی نمایاں تھے۔ اور خیر ہوئی تھی یاسمین کو ہمارے حال پر ترس آگیا تھا اور وہ اک بیک معقولیت پسند ہو گئی تھی اور اس نے اپنی دانست میں ایک صحیح راہ یہ نکالی تھی کہ وہ کشاں کشاں مجھے اپنے پاپائے معظم کی بارگاہ میں لے گئی تھی۔ اور ان کی عالی جناب میں باریاب ہوئی تھی۔ اسے خیال تھا کہ ہم اپنے ذاتی کرشموں کی بنا پر بزرگ محترم کو تسخیر کرنے میں کامیاب ہوں گے۔ اور خیر سے کوئی ایسی سبیل نکال لیں گے جس سے ایک دوسرے کے جذباتِ عالیہ کو مجروح ہونے سے بچالیں گے کیونکہ اسے کامل یقین تھا کہ بزرگ محترم ہماری ذات سے بے حد متاثر تھے —— لیکن یہاں بھی ہمارے لئے مقام شکست تھا — اور آج ان کی جناب میں شرفِ نیاز حاصل کرنے کے سلسلے میں تو ہمیں یہ جانکر سخت حیرت ہوئی تھی کہ وہ پاپائے معظم یاسمین کے پدرِ محترم نہیں بلکہ عمِ مکرم تھے جو اس نیک بخت لڑکی کی میراث پدری کے ٹرسٹی تھے اور ایک ٹرسٹ وثیقہ کی بنا پر اس کی ساری غیر منقولہ جائداد کے منتظم تھے۔ لیکن بڑے مشفق اور مہربان چچا تھے کہ اس لڑکی سے کامل پدرانہ سلوک رکھتے تھے اور اہل دنیا پر ہمیشہ یہی ظاہر کرتے تھے کہ وہ ٹرسٹی نہیں بلکہ اس کے پاپا تھے۔ حضرت نے بڑے تپاک اور گرم جوشی کے ساتھ ہمارا خیر مقدم کیا تھا اور ان کے لطف و کرم کا سمندر تو فی الفور جوش میں آگیا تھا۔ انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ ہم عنقریب انہیں داغِ مفارقت دے جائیں گے چنانچہ وہ اپنے جذبات سے بے قابو ہو گئے تھے اور اپنی حدوں سے گذر گئے تھے وہ نعرہ زن ہوئے تھے کہ اگر ہم گئے تو ہمیں

ان کی نعش پر سے گذرنا ہوگا۔ یہ ان کے شدید قلق روحانی کا مظہر تھا اور اس شگین دعائی سے ہمارا دل لرز گیا تھا۔ آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے تھے اور حضرت کی نگاہیں بھی اشک ریز ہو گئی تھیں۔ ہم اس نظارے کی مزید تاب نہیں لا سکے تھے اور ہم جو حکایتِ غم انہیں سنانے آئے تھے ہمارے ذہن سے محو ہو چکا تھا۔ اور ہم جب رخصت ہوئے تھے تو حضرت نے تاکید کی تھی کہ ہم شام کو اُن سے ضرور ملیں۔

سرِشام جو ہم ان کے درِ دولت پر عقیدت کے پھول چڑھانے کے لئے حاضر ہو گئے تھے تو حضرت نے نہایت رازدارانہ انداز میں ہمیں ایک رجسٹری شدہ وثیقہ پڑھ کر سنایا تھا۔ یہ وہی "ٹرسٹ" تھا۔ اس کے مندرجات دلشکن، حسرت آفریں اور بصیرت افروز تھے جس کے ایک حصے کا خلاصہ درج ذیل ہے:۔

"یاسمین المسمہ بہ ..... اپنے سن بلوغت سے تجاوز کر کے ۲۲ سالگرہ پر اپنی ذہنی اور جسمانی ارتقا کی منزلوں کو عبور کرنے کے بعد ہی شادی کا مجاز رکھتی ہے۔ اور یہی ٹرسٹ کی میعاد ہے۔ اس کی خلاف ورزی کی صورت میں ٹرسٹ کا اسّی فی صد حصّہ ملک کے فیاض اداروں کو منتقل شدہ سمجھا جائے گا۔"

اور یہ قانون کی ایک ناروا قید تھی، اور قانونی چارہ جوئی سے اس کی تنسیخ بھی ممکن تھی۔ اور سخت حیرت انگیز بات یہ تھی کہ عاقبت ناشناسی، خیرگیٔ طبع، تندیٔ مزاج اور وجدانِ طبع کا تخریبی رجحان اس لڑکی کے اطوار

کے کچھ درج شدہ اضافات و اکناف تھے۔ جو اس ٹرسٹ کے باعث بنے تھے۔
حضرت خاموش تھے۔ لیکن ان کی خاموشی پر تکلم فدا تھا لیکن در حقیقت ان کی خموشی متکلم تھی اور اس قدر متکلم تھی کہ ہمارے نہ کئے گئے سوالات کا ہر جانب سے اور ہر جہت سے طوطی بہ طوطی جواب دے رہی تھی۔ آخر ایک عرصے کے بعد حضرت نے مہرِ سکوت توڑ ہی دیا تھا اور اپنی زبان سے ساری بات اشارتاً کہہ ہی گئے تھے۔ لیکن آپ نے وضاحت کے ساتھ کھل کر بات نہیں کی تھی کیونکہ آپ کا انداز ڈرامائی تھا۔
" میں کہتا ہوں تم لوگ شادی کرلو مجھے کوئی اعتراض نہیں، لیکن....."
آپ نے نہایت خوبصورتی سے ڈرامے کا افتتاح کر دیا تھا۔ اور اس ڈرامے میں " لیکن " کا ٹکڑا سارے پلاٹ کی جان تھی کیونکہ اس " لیکن " میں ڈرامے کی ساری ٹریجڈی پنہاں تھی اور پھر اس ٹریجڈی کا ایک اہم کردار حضرت کی ذات والا صفات تھی اس لئے کہ آپ میں ہمت نہیں تھی اور جسارت نہیں تھی! اور یہی وجہ تھی کہ آپ اس اہم ٹکڑے کو پردہ سیمیں پر فاش کرنے سے احتراز کر رہے تھے۔
دل سے دعا نکل رہے تھے اس پیرِ ناتواں کے لئے کہ اے ناخدا ترس تیرا کیا بگڑ جاتا جو تو نے ہمیں بروقت آگاہ کر دیا ہوتا کہ سمجھ کر قدم اٹھاتے اور اس قدر آگے نہیں نکل جاتے لیکن زبان کو یارائے گفتگو نہیں تھا۔ ع
" لب بہ بند و چشم بند و گوش بند "

"وہ آپ آباد رہیں۔ شاد رہیں۔ اور آپ بالکل مطمئن رہیں ان ہاتھوں سے کسی معصوم زندگی کا خون نہیں ہوگا۔" ہم نے بھی اپنا پارٹ اس ضعیف سے کم نہیں نبھایا تھا۔

اور یہ ہمارے اس طویل ڈرامے کا ڈراپ سین تھا۔ یہ سین اسقدر دلدوز اور نظارہ سوز تھا کہ ناظرین پر سکتے کا عالم طاری تھا اور یہاں دل تھام کر بیٹھ گئے تھے اور پھر ہوش رخصت ہو گئے تھے اور پھر ہوش میں آ گئے تھے لیکن اب ہوش کس کام کا۔ بخدا ہمیں ہوش کی ضرورت نہیں تھی۔ ضرورت تھی دن رات ایک بیخودی کی!!

ہمارا سینہ ریش ریش تھا اور دل مجروح تھا لیکن دل ہرگز ہرگز معترف نہ تھا کہ اب بھی یاسمین تندخو ناعاقبت شناس اور تخریب پسند تھی بلکہ میری زبان کلمہ گو تھی کہ وہ ہرگاہ ایک پاک طینت، نیک سیرت نیک خصائل اور فرشتہ شمائل دوشیزہ تھی۔ اور اس کی بے داغ سیرت زہرہ و ناہید کی طرح سوز اور تاباں تھی۔ اور ہمیں ٹرسٹ کے قوانین کی دھجی اڑتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ فطرت کا قانون اس کے پرزے پرزے اڑا رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ اے قانون تو بڑا فلسفی ہے لیکن تو نرا گدھا ہے کہ تو جب بن رہا تھا تو تجھے یہ جاننے کی تمیز نہیں تھی کہ یاسمین کی تخریب پسندی کی کوئی میعاد نہیں، تیری مثال اس فلسفی کی ہے جو اپنے فلسفہ کے زور سے اسپ تازی کو بے سینگ کا بیل کہے

۱۹ جنوری ۱۹۲۶ء کا دن ـــــ آفاق سے اس کا نزول ہمارے

اور یہ ہوا تھا۔ یہ ہمارے لئے خوشی کی نوید میں الجھا کر ایک دل شکن پیغام بھی لایا تھا۔ اس نرالی تقریب کی وہ گھڑی بھی کیا گھڑی تھی کہ ہمارے کوچ کی خبر آ گئی تھی۔ اس کوچ میں اپنے وطن کو لوٹنے کا پیغام تھا جس میں کہ یونان کی دل چھینے والی سرزمین سے جلاوطن ہونے کی بھی خبر تھی۔ اس میں خوشی اور غمی باہم ملی ہوئی تھی۔ اور اس تضاد کے امتزاج کا دل و دماغ پر بڑا اثر پڑا تھا۔ دل کو ایک دھچکہ لگا تھا کہ ہم جینے کی ادا بھول رہے تھے۔ اس دی گئی حالت میں مصیبت یہ درپیش تھی کہ ہم خوشی اور غمی دونوں کی تقریب باہم کیونکر منائیں۔ یہ تفکرات غیر طبیعی تھے جو ہمارے احساسات طبیعی کے مولد تھے اور چونکہ ہم فرد بشر تھے اور عالم طبیعی کے قوانین کی زد میں تھے، ہمارا دل خود بخود پاش پاش ہونے لگا تھا۔ یہ کہنا ہمارے لئے مشکل تھا کہ اس کے صحیح اسباب کیا تھے۔ صحیح بات یہ بھی نہیں کہ ہمیں یونان کے آب و گل سے اس کے پہاڑوں کی چٹانوں سے اور اس کے سمندر کی موجوں سے خاص محبت تھی اور اپنے وطن کی خاک سے نفرت تھی۔ شاید اس لئے کہ ہم کسی کے رخِ زیبا کی چوٹ کھائے بیٹھے تھے اور اس صنم کا پیارا پیارا مکھڑا ایک آن میں ہماری نگاہوں سے اوجھل ہونے والا تھا۔ لہٰذا دل پر شاق گذر رہا تھا صحیح اسباب یہ بھی نظر نہیں آرہے تھے درآنحالیکہ ہمارے چند ہم سفر رخِ زیبا کے مجنوں شہادت گاہ سے فرار ہو گئے تھے، اور انہوں نے اپنی اپنی جانوں کے تحفظ کی خاطر اپنی اپنی محبوبہ کو بیوی بنا لیا تھا۔ سوچنے کی بات تھی یہاں کیا چیز مانع آئی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ رخِ زیبا کے مجنوں ہی نہیں تھے کیونکہ وہ

جنون ہی کیا جو کبھی ہے اور کبھی نہیں۔ جنون تو وہ ہے جو سدا باقی رہے
آپ ان سے پوچھیے تم اس بے بہا شے کو یونان کی یخ بستہ سرزمین میں
کیوں چھوڑ آئے۔ تمہاری سر فروشی اور جگرداری کدھر گئی کہ تم میدان میں
اترے بھی نہیں تھے کہ بھاگ نکلے۔ اور یہ کیا۔ تم اپنے ہمراہ کس خلعت کو لے
چلے۔ وہ رخِ زیبا جس کا تخیل تمہارے ذہن نے باندھا تھا کیا اس کی تعبیر یہ
ہے۔ جسے تم پچھلے باندھ کر لے جا رہے ہو۔ اور تشنۂ حل یہ مسئلہ ہے کہ یونان
کی ۵۰ لاکھ آبادی میں سے تمہیں صرف ایک ہی کیوں پسند ہے؟ صحیح بات تو یہ
ہے کہ یونان کی آبادی کا کوئی قصور نہیں البتہ فساد ہے اپنی نگاہِ انتخاب کا۔
پھر آپ اچھے چاہنے والے نکلے کہ آپ یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ ایک اسقدر پسند
کیوں ہے! صحیح بات یہ ہے کہ آپ حسن کے شیدا نہیں اور آپ اس کے غایت
سے بے خبر ہیں ـــــ اس لئے کہ آپ ازمنۂ وسطہ کے وہی سورما ہیں جو جنس
محبت کی خریداری کرتے تھے۔ لیکن ٹھہرئیے! خریدار بھی تو صحیح معنوں میں
صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جو نقد نہ گنوا کر دائم خریداری کی استطاعت
رکھتا ہو کیونکہ جس دم اس نے کچھ خرید لیا وہ خریدار باقی نہیں رہا۔ پھر آپ
کی صحیح تعریف کیا ہوئی؟ ـــــ آپ ازمنۂ وسطہ کے فقط ایک سورما ہیں اور
آپ عہد حاضر میں رہ کر اسی ازمنۂ وسطہ میں فرد کشی ہیں ـــــ معاذ اللہ

۱۳۷

الوداع :-

۲۲ر جنوری ۱۹۴۶ء کا دن اپنے ذہن میں ایک حادثے کی طرح
محفوظ رہے گا۔ اور یہ دن تو بذات خود زمان و مکاں کا ایک حادثہ
تھا۔ آج وقت کی رفتار سست سست تھی اور ایک عجیب عالم سوز و
گداز تھا ـــ شاید دور آفاق سے ہلاکت خیز کائناتی شعاعوں کا آج ادھر
ہی نزول تھا۔ ہر سو ویرانی مسلط ہو رہی تھی اور ہر شے گویا بتدریج فنا
ہوتی جا رہی تھی۔ اور عین ایسے زوال کے وقت میں ہم وہ رند ازلی تھے
کہ ساقی کو یونان میں چھوڑ چلے تھے اور شور و مستی کی مے سرکش کا خمکدہ
اپنے دوش پر سنبھالے یونان کی مستی بھری بہاروں سے تخلیہ کرتے
جا رہے تھے۔ سہارے کے لئے فی امان اللہ۔ عزم اور حوصلہ ہمارے
دو ازلی ساتھی تھے جو ہر بیابان کو گلشن اور ہر خیاباں کو ارم بنانے کی ٹھانے

ہوئے تھے۔ لیکن بات جسارت سے بعید تھی، ساقی کی نگاہیں اشک ریز تھیں جو تمام حوصلے اور سارے عزائم کو سرد کئے دے رہی تھیں اور اپنا بھی عیار جسم خاکی تھا جو صفِ ماتم بچھاتا جا رہا تھا۔ اور اپنی جبلّی کمزوری کے علاج پیہم پیش کرتا جا رہا تھا۔ صبر و سکون کا دامن چاک چاک تھا، قدم ہائے خاکی لغزش میں تھے۔ دل ڈوبتا جا رہا تھا اور حسرت و تاسف کے گل کا دو در کارواں نثار کرتا جا رہا تھا۔ لیکن خیر ہوئی تھی کہ ساقی کی پرنم نگاہوں میں حزن و ملال کے علاوہ ایک شے تھی جس میں انوارِ سماوی کی مکمل جھلک موجزن تھی۔ یہ ہمارے کام آگئی تھی۔ اس سے ہم نے کچھ لمعانِ نور مستعار مانگ لئے تھے جو ہمارے لئے باعثِ تمکین ہوئے تھے اور جن کے فیض سے ہم زندہ تھے۔ اور یہ ہماری زندگی کی اس شبِ تاریک کے سفر میں قندیل رہبانی بنے تھے۔ قدم قدم پر مقامِ شکست تھا اور یہ مقامِ شکست تھا صحرائے جنوں کے اسی دلشدہ اور سرگشتہ کے لئے جس کی کفِ خاک اس کی فنائے محض کی دلیل تک ہی تھی جس میں کہ وہ زندگی کے استدلالی عبث ڈھونڈھتا تھا لیکن وہ استدلال اسے ملے تھے۔ ساحلِ فرات سے لے کر کربلائے معلیٰ تک جہاں کی ذرہ ذرہ خاک میں صدائے قم ترنم ریز تھی۔ اور کربلائے معلیٰ سے لے کر بغداد مقدس تک جس کے ریگ زاروں اور نخلستانوں میں جذب شوق اور شور و مستی کا ایک دریا موجزن تھا۔ اور بغداد مقدس سے لے کر ایران کی مغربی سرحد تک خلا و ملا میں شور سلاسل کی جھنکار غلغلہ انداز تھی اور ایران کی مغربی سرحد سے لے کر شام کی شمالی سرحد تک ہواؤں میں اور

فضاؤں میں سرود رفتہ کے جاں نواز نغمے فردوس گوش تھے۔ اور شام
کی شمالی سرحد سے لے کر ساحل نیل تک بوئے پیراہن کی شمیم شامہ نواز تھی
طبقات خلائی سے لے کر تحت الثریٰ تک خون مسیحا کی پاکیزگی اور طہارت
عفوِ خون کا برملا اعلان کر رہی تھی۔ اور حسن یوسف اور ید بیضا کی خیرہ کن تجلیاں
شش جہات میں بے قرار اور بے تاب نظر آتی تھیں۔ اور ساحلِ نیل سے
لے کر تیونس کی سرحد تک قافلہ ہائے کہن کی گرد ہنوز جانبِ کہکشاں رواں
تھی۔ افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں سے اور بحر روم کی مضطرب اور پر آشوب
موجوں سے اب بھی وہ نعرہ ہائے ازلی بلند ہوتے تھے جو پردۂ افلاک چیرتے
جاتے تھے۔ اور دل ہاتھوں سے نکلتا جاتا تھا اور ہر مقام پر جان و دل کے
ارمغاں پیش کئے تھے۔ اور رومۃ الکبریٰ کے انسان کش میدانوں گلزاروں
مرغزاروں اور شاخساروں میں صبر آزمائی جاں طلبی اور روح فرسائی
کے ہر مرحلے میں اور ہر منزل میں جان بچھا دی تھی لیکن زانو تہ نہیں کئے تھے۔
لیکن . نگا ہے یا رسول اللہ نگا ہے! ـــ یہاں یارا نہیں تھا کہ نور السموات
کا ارمغاں لے کر بازپسیں قدموں سے اپنے وطن کو لوٹ جاتے۔

اس مجنونِ صحرا گرد نے تقدیر کے مارے مشرق سے لے کر تدبیر کے مارے
مغرب کی سرزمینوں کی خاک اڑائی تھی۔ ان آنکھوں نے بحر و بر اور دشت و
دمن میں جنونِ ملوکانہ کی چنگیزیت اور غارت گری دیکھی تھی۔ شانِ ملوکانہ
کی شانِ کج کلاہی کی رہزنی سفاکی اور خون ریزی دیکھی تھی جو بذاتِ خود
اس کی سطوتِ عالی اور شانِ والا کی تحقیر اور توہین تھی جس سے ضمیرِ شیاطین

لرز لرز گیا تھا۔ اور دریغا دریغا ان آنکھوں نے پورِ خلیلؑ کو آتشِ نمرود کو بھڑکاتے، اس کی ایندھن بنتے، اسمیں جلتے اور آہ وزاری کرتے دیکھا تھا۔ اے کاش ہماری آنکھیں یہ رُوح فرسا نظارے نہ دیکھیں اِن آنکھوں نے آلِ آدم کی رسوائی ناموسِ انسانیت کی غارت گری دیکھی تھی۔ انسانیت کو دم توڑتے دیکھا تھا۔ دل پاش پاش ہو گیا تھا اور صبر و سکون کا قافلہ لٹ گیا تھا۔ طائرِ زیرِ دام کی طرح تڑپے تھے پھڑپھڑائے تھے۔ مرغِ بسمل کی طرح رقص کئے تھے۔ لیکن حمیتِ بشری اور حوصلۂ انسانی کی شمشیر کے لئے یہ سب کچھ محض سنگ فساں تھے۔

لیکن آج اس نگاہوں کے مارے کے لئے صبر و سکون کا یارا نہیں تھا چہ جائیکہ ان نگاہوں کی شمشیر کی تیزیاں بخیلا اسی کے جان و جگر کے سنگ و فساں کی ممنونِ منت تھیں۔ عشق و وفا اور صدق و صفا کی منزل میں محمل لیلےٰ کا زمام اس حدی خوانِ صحرا کے ہاتھوں میں تھا، لیکن یہ کیسی بوالعجبی تھی کہ اسے سکونِ قلب میسر نہیں تھا۔ اور نور اللہ مرقدہٗ ان حسرتوں کی میت جو اس کے زیبِ دوش تھی اس کے لئے سہانِ روح تھی اور اسے عین منزل میں گمراہ کئے دے رہی تھی۔ لیکن وہ خون گشتہ حسرتیں عشق و رقت کے میدان میں ان نحیف و نزار خیلِ سیاہ کی طرح شہید ہوئی تھیں جو آدابِ جنگ سے بے خبر ہونے کی وجہ اپنی موت آپ مر گئی تھیں۔

حسن و الفت کے مشہد میں اور عشق و رقت کے مقتل میں جنگ یکطرفہ ہے جہاں کوئی حریف نہیں نہ مقابل نہیں، خنجر آزما نہیں۔ اپنا خنجر ہے اور اپنا سینہ۔

اپنی شمشیر ہے اور اپنی گردن! ۔ محاذ انوکھا ہے مہم نرالی ہے ۔ یہاں شجاعت بھی ہے ، جگرداری بھی ہے ، اور جاں سپاری بھی ہے ، فتح و نصرت بھی ہے اور کامرانی بھی ہے ! ــــ لیکن اس روزِ مبارک میں نصرت و کامرانی کا وہ خجستہ پیکر کس سعادت مندی کا مظاہرہ کر رہا تھا ۔ کیا وہ وہی نے نواز تھا جس کی نے نوازی اس کے دل کے نیستاں کو پھونک چکی تھی ؟ جس کے سرودِ ازلی کی لے خود اس کے دل کی دنیا کو خاکستر کر چکی تھی ۔ جس نے مدتوں مژگانِ چشم سے ساقی کے آستانۂ حسن کی جاروب کشی کی تھی اور ایک دن ساقی کی نگاہوں کے چھلکتے ہوئے پیمانے سے سرشار ہو کر جام و سبو اور شیشہ و پیمانہ توڑ دیا ہو ؟ جس کی استغنا اور بے نیازی نے نہیں بلکہ کام و دہن کی عین تشنگی نے اسے لبِ نیل مستقی رکھا ہو بھلا آپ اس کے دل کی کیفیت کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس نے ایک غارت گرِ عقل و دیں کے ہاتھوں اپنے صبر و سکوں کی قبا چاک کی اور پھر اسی کے ہاتھوں دل کی حسرتوں کی گرہ بھی پاک کی !

"وہ کس پردے میں ہے آئینہ پرداز اے خدا
پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں !"

یونان کی تقدس نشاں سرزمین میں ۔ ایک دل شدہ اور خستہ دروں اس کے میدانوں ، سنگلاخوں ، کوہستانوں اور شہرستانوں میں سڑکوں اور بازاروں میں ہادیہ پیما تھا ۔ کسی فردِ بشر سے وہ نگاہِ التفات کا محتاج نہیں تھا کیونکہ ایک وظیفہ جو وہ رکھتا تھا اور اپنے مشن کا ایک نشان جو اس کے

پاس تھا کسی دل سے کچھ تہنیت اور خراج تحسین کا سزاوار نہ تھا چنانچہ
ہر فرد بشر اس سے کشیدہ نظر آتا تھا۔ اور وہ ہر کس و ناکس سے
ہمدردی اور تلطف کی رحمت سے یکسر محروم تھا۔ لیکن وہ اتنا برا نہیں تھا۔
ایک دن اس کی صحرا نوردی بادیہ پیمائی اور دشت و در کی خاکبازی کے صبر آزما
اور جاں طلب مراحل میں مہر و رقت کا ایک تلاطم خیز سمندر اجنبی سی مٹی کے
ساحل پر ملا تھا، اس میں وہ غرقاب ہو گیا تھا۔ لیکن مرگِ سیرابی سے پیشتر سمندر
کی طغیانیوں نے اسے ساحل پہ ڈال دی تھیں۔ اس کی آنکھوں سے آنسو امنڈ
آئے تھے اور رحمتِ حق گھٹا بن کر چھا گئی تھی۔ رحمت کی سہر دبارش شروع
ہو گئی تھی کہ ایک بجلی کوندی تھی۔ صاعقۂ طور کی طرح جس کی بے محابا تجلیوں
میں عنقائے محبت کا بلند آشیانہ جل گیا تھا اور محبت برہنہ بے نقاب اور
ساری خلعتوں سے پاک ہو گئی تھی۔ اس قدر بے نقاب ہو گئی تھی کہ خاکی انسان
کی آنکھوں کو یارائے دید نہیں تھا۔
اس جانِ پاک کی قسم اس ناتواں شہید وفا کے لئے اس ذبحِ عظیم
کے سنگین مرحلے میں جاں سپاری ہی اس کی سپر تھی کہ شمشیر زن کی ہر ضرب
لاثانی، ہر یورش مکمل اور ہر کاٹ قطعی تھی، لیکن ملاحظہ ہو ملاحظہ کہ قاتل
کو شمشیر آزمائی کا یارا نہ تھا کہ وہ ایک ہاتھ سے شمشیر تھامے اور دوسرے
ہاتھ سے دل کو تھامے، افتاں و خیزاں مقتل سے تخلیہ کر رہا تھا۔۔۔ فطرت
کا وہ آرٹسٹ کہاں جس نے اس دیدہ ریزی سے اپنی امت کی تصویر کشی کی ہے؟۔۔۔

الوداع۔ الوداع۔۔۔ ختم شد